اسلام کی حکیمانہ زندگی



از ارشادات

سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

ادارہ حضرت مقدادؓ

اسلام کی حکیمانہ زندگی

از ارشادات

سرکار شریعت سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی اعلیٰ اللہ مقامہ

ناشر

ادارہ حضرت مقدادؓ

نام کتاب	اسلام کی حکیمانہ زندگی
از ارشادات	سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی اعلی اللہ مقامہ
کمپوزنگ	سید قمر عباس زیدی
ڈیزائننگ	ولایت علی ابراہیمی
طابع	سید غلام اکبر
ناشر	ادارہ حضرت مقدادؓ
تعداد کتاب	1000
اشاعت اول	۱۳۵۴ھ
اشاعت دوم	۳ر رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۸ر فروری ۲۰۲۰ء بروز شہادت امام علی نقی علیہ السلام

فہرست

انتساب

ہم اپنی اس کاوش کو منتقم کربلا، امام عصر و زمانؑ
فرزند حضرت حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا
حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف
کے نام کرتے ہیں۔

حالاتِ زندگی سید العلماء

نسب:

سید العلماء سید علی نقی عرف نقن صاحب، جناب ممتاز العلماء اطوالحسن (منن صاحب) کے فرزند تھے۔ جو شمس العلماء سید ابراہیم بن جنت مآب سید تقی بن سید العلماء سید حسین علیین مکان ابن غفران مآب دلدار علی کے فرزند تھے۔ مولانا سید علی نقی ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء کو لکھنو میں متولد ہوئے۔ ابھی آپ کی عمر ۳، ۴ سال کے درمیان تھی کہ آپ کے والد ماجد ۱۳۲۷ھ میں مع متعلقین تکمیل علوم کے لئے نجف اشرف تشریف لے گئے۔ آپ کی عمر ۹ برس کی تھی جب ۱۳۳۲ھ میں آپ کے والد گرامی ہندوستان واپس آئے۔

اس وقت تک آپ کی صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں ختم ہو چکی تھیں۔ لکھنو واپس آکر آپ کے والد صاحب طاب ثراہ نے آپ کی تعلیم اپنے ذمہ رکھی۔ والد کی علالت کے زمانے میں آپ کے برادر معظم مولانا سید محمد عرف میرن صاحب آپ کو پڑھاتے تھے۔ سرکار سید العلماء نے مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس دونوں جگہ داخلہ لیا۔ مدرسہ ناظمیہ کے فاضل اور سلطان المدارس کے سند الافاضل کا ایک ہی ساتھ امتحان دیا۔

سفرِ عراق:

سید العلماء ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں تکمیل علم کے لئے عراق تشریف لے گئے۔ قیام عراق کا پانچ سالہ دور مرحوم کا ایک زریں باب ہے۔ ان پانچ برسوں میں آپ نے فقہ و اصول میں وہ ملکہ پیدا کیا کہ اس دور کے ۳ مجتہدین یعنی آیۃ اللہ اصفہانی، آیۃ اللہ نائینی اور آیۃ اللہ سید ضیاء الدین عراقی نے آپ کو واضح الفاظ کے اجازے دیئے۔ علم کلام اور دفاع مذہب میں آپ کی مہارت کا لوہا سید محسن امین عاملی، شیخ جواد بلاغی محمد حسین کاشف الغطاء اور سید عبد الحسین شرف الدین موسوی نے مان لیا۔

نجف میں عربی تصانیف:

نجف میں پہنچ کر سب سے پہلے جو کتاب آپ نے تصنیف کی وہ وہابیت کے خلاف تھی جو

بعد میں ''کشف النقاب عن عقائد عبدالوھاب'' کے نام سے شائع ہوئی۔ عراق وایران کے مشہور اہل علم نے اس کتاب کو ایک شاہکار قرار دیا۔ دوسری کتاب ''اقالۃ العاثر فی اقامۃ الشعائر'' ماتم وغیرہ کے جواز میں۔ تیسری کتاب ''السیف الماضی علی عقائد الاباضی'' خوارج کی رد میں چارسو صفحہ کی کتاب ہے۔

خطابت:

سید العلماء کی خطابت کا ایک خاص رنگ تھا جو عبارت آرائی وستی نکتہ آفرینی کے بجائے علم اور تحقیق پر مبنی تھا۔ اور ایک گھنٹہ کی مجلس میں حقائق کے کتنے دروازے واہو جاتے تھے ان کی تقریر اور تحریر میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ دوسری خاص بات ان کی تقریروں میں یہ تھی کہ ہر مذہب وملت کا ماننے والا اسے اطمینان قلب کے ساتھ سن سکتا تھا۔ اور فیض یاب ہوسکتا تھا۔ کسی جملہ سے کسی کی دل آزاری کا خطرہ نہیں تھا۔

لکھنو یونیورسٹی:

عراق سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۳۲ء میں آپ لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے وابستہ ہو گئے۔ اور سترہ برس تک طلباء کو فیض پہنچاتے رہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی:

۱۹۵۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو شعبہ دینیات کے شعبے میں ریڈر مدعو کیا اور آپ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ پھر آپ شعبہ دینیات کے پروفیسر بنائے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے علی گڑھ ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۷۷ء میں لکھنو کے کچھ شرپسندوں نے آپ کے لکھنو کے مکان میں آگ لگادی۔ جس میں ہزاروں قیمتی کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ اس میں آپ کے عربی تصانیف کے مطبوعہ مسودات بھی تلف ہو گئے جن کا ان کو آخر عمر تک صدمہ رہا۔

وفات:

آپ نے یکم شوال روز عید الفطر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۸ رمئی ۱۹۸۸ء کو لکھنو میں رحلت فرمائی اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

اقتباس از کتاب رسالہ شادی خانہ آبادی

سرکار آیۃ اللہ سید العلماء سید علی نقی نقوی المعروف نقن رحمۃ اللہ علیہ تاریخ شیعت کا وہ درخشندہ ستارہ ہے کہ جس نے اپنے قلم و بیان سے تاریخی، سیاسی، سماجی و مذہبی ۳۰۰ سو کے قریب علمی و تحقیقی کتب و رسائل تحریر کر کے اور ہندو پاک و دیگر ممالک میں منبر کے ذریعے حقیقی اسلام اور مکتب اہل بیت کا ایسا جامع و مکمل تعارف کرایا کہ بعد والوں کے لیے آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر ہر حرف اور آپ کے قلم سے تحریر شدہ ہر ہر جملہ اپنی جامعیت اور پُر معنی ہونے کی وجہ سے مشعل ہدایت بن گیا۔

سید العلماءؒ نے لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر پیغام اسلام پہنچایا۔ انھیں خدمات میں سے آپ کی ایک خدمت شادی بیاہ کے حوالے سے مختلف مواقع پر اصلاحی خطبات اور اس موقع پر غیر شرعی رسوم کے خلاف تحریری بیانات ہیں جن میں رسالہ نظام ازدواج، رسالہ شادی خانہ آبادی، رسالہ ہمارے قیود و رسوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رسالہ نظام ازدواج سرکار کے اس بیان کا خلاصہ ہے جو آپ نے سید ابن حسین نقوی مرحوم آنریری سیکریٹری امامیہ مشن کے فرزند کے عقد کے موقع پر ۱۹۵۷ء کو فرمایا تھا۔ اس شادی پر تین چیزوں کا خاص خیال رکھا گیا تھا:

(۱): اس میں کسی قسم کی فضول، غیر شرعی اور ہندوانہ رسوم کو انجام نہیں دیا گیا۔

(۲): تاریخ برصغیر میں شاید پہلی مرتبہ شوہر کی طرف سے زوجہ کو وکالت طلاق کا حق بھی دے دیا گیا تھا۔ اس وکالت کا جو کہ عقد نکاح میں بشرط معلوم کے صیغے کے ساتھ ادا کی گئی کا فائدہ یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ شوہر نان و نفقہ نہیں دیتا، ظلم و ستم کرتا ہے یا گھر سے نکال دیتا ہے وغیرہ وغیرہ اور طلاق بھی نہیں دینا چاہتا تو عورت اس وکالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود یا کسی کو اپنا وکیل بنا کر طلاق کا صیغہ پڑھ کر اس شوہر سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔

(۳): اس نکاح میں مہر فاطمیہ کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا جس کی تفصیل رسالے میں موجود ہے۔ ان رسائل کو باقر رضا انچارج لکھنو برانچ امامیہ مشن نے افادہ عمومی کے لیے دوبارہ نشر

فرمایا۔

شادی حکم شریعت اور فریضہ الٰہی ہے۔ حکم شریعت کی انجام دہی شریعت کی طرف سے آسان ہوتی ہے ہم اپنی رسومات کی وجہ سے اسے مشکل کر لیتے ہیں۔ آج جبکہ ان رسائل کی اور ان تعلیمات کی اشد ضرورت ہے تو ہم نے اس شادی پر جس میں یہ رسالہ بصورت کارڈ چھپوایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شادی کے موقع پر مختلف قسم کے قیمتی کارڈ پیش کرنا جن کا پیغام رسانی کے علاوہ کوئی دوسرا فائدہ نہیں اور بعد میں ردی کاغذ کے عنوان سے کوڑے میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ اسے ایک بامقصد مختصر مگر جامع رسالے کو پیش کیا جائے کہ شاید کوئی اس سے ہدایت حاصل کر سکے اور اس طرح یہ رسم خیر چل نکلے کہ اس قسم کے دیگر مذہبی رسائل کو کوئی اور بھی اس قسم کی مناسبت پر زندہ کرے گا جیسا کہ بعض مذہبی گھرانے پہلے سے کرتے آرہے ہیں۔

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ علی سید المرسلین محمد المصطفیٰ وآلہ الطاھرین

وہ موضوع جس کے متعلق مجھے ان دس دنوں میں بیان کرنا ہے اشتہاروں کے سرنامہ میں آپ حضرات کے پیش نظر ہو چکا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرا موضوع بیان "اسلام کی حکیمانہ زندگی اور اس کی بے مثال عظمت" ہے۔

جس طرح ایک موضوع کی تنگ دامنی، ایک ایسے مقرر کو جو موضوع کے احترام کرنے کی عادت رکھتا ہو، اور اپنے کلام کو موضوع کا پابند قرار دیتا ہو، بے دست و پا بنا دیتی ہے۔ اسی طرح موضوع کی وسعت، ایسے مقرر کو جو موضوع کے متعلق تمام ضروری باتوں کو بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہیے گنگ بنا دینے کے لئے کافی ہے، وقت تنگ ہو اور موضوع کی وسعت بیان زیادہ چاہتی ہو اس وقت نہ پوچھئے کہ کس قدر دشواری محسوس ہوتی ہے۔

دس دن ہیں لیکن موضوع اس قدر وسیع ہے کہ دس عشرے بیان کئے جائیں تب بھی وہ تشنگی کی شکایت کرے۔

اسلام کی حکیمانہ زندگی اور اس کی بے مثال عظمت

دوسرے جز کو چھوڑ دیجئے اس کی توضیحی حیثیت ہے صرف پہلا جزو ''اسلام کی حکیمانہ زندگی''، یعنی اسلام نے انسان کی زندگی کے لئے کیا اصول، کیا آئین اور کیا قاعدے مقرر کئے ہیں اور ان میں کتنے حکیمانہ پہلو ہیں اسے میں دس دن میں بیان کرسکوں دشوار ہے۔

بہر حال عرض کروں گا اور جو کچھ ہو سکے گا عرض کروں گا مختصر طور پر ہی۔

زندگی کا حقیقی مفہوم

''اسلام کی حکیمانہ زندگی'' اس کے لئے سب سے پہلے تو ہمیں ضرورت پڑتی ہے عام طور پر زندگی کے معنی سمجھنے کی کہ زندگی کے معنی کیا ہیں؟

جب زندگی کے معنی سمجھ لیں تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہوگی کہ انسان کی زندگی کیا ہے؟ جب انسان کی زندگی کا معیار بھی ہم نظر عقل سے مقرر کرلیں تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام نے انسان کی زندگی کے لئے کیا اصول اور آئین مقرر کئے ہیں؟ اور اسلام کے مقررہ اصول اور نظام زندگی کا ہم کو موازنہ کرنا ہوگا، دنیا کے تمام نظام ہائے زندگی سے جو مختلف اقوام وملل نے جماعتی وانفرادی زندگی کے لئے مقرر کئے ہیں، اس کے بعد ہم کو حق ہوگا یہ کہنے کا کہ اسلام نے جو نظام زندگی پیش کیا ہے وہ بہترین نظام زندگی ہے۔ اس لئے کہ جس وقت تک ضد کے مقابل میں ضد نہ آئے، اس کے لئے کسی فضیلت کسی عظمت کا دعویٰ درحقیقت ویسا ہی ہے جیسے ''تنہا پیش قاضی روی راضی آئی''

یعنی یک طرفہ کسی شئے پر نظر ڈالئے اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اس تصویر کا ایک ہی پہلو دیکھا لیکن دوسرے پہلو کو جس میں آپ کو کمزوری کا اندیشہ تھا چھوڑ دیا آپ اگر اسلام کے کسی نظام زندگی کی عظمت کو ثابت کرنا چاہیں تو آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ دنیا کے دوسرے قوانین پر نظر ڈالیں، تب آپ کو حق ہے یہ کہنے کا کہ اسلام کے اصول میں جو عظمت پائی جاتی ہے وہ کسی مذہب میں نہیں۔

زندگی کا مفہوم ظاہری حیثیت سے تو بہت کھلا ہوا ہے لیکن حقیقتاً بہت مبہم ہے "زندگی" صرف کسی شئے کے کسی نہ کسی حیثیت سے موجود ہونے کا نام نہیں ہے، موجود ہونے کے علاوہ زندگی کا کچھ اور مفہوم ہے۔ ایک وہ ہے جس کے لئے آپ کہتے ہیں جاندار ہونا، یہ زندگی وہ ہے جو درحقیقت ہر حیوان میں پائی جاتی ہے اور اس کا معیار یہ ہے کہ جب تک روح نے جسم سے جدائی نہیں اختیار کی زندگی ہے، یہ زندگی ایسی ہے جس کے لئے کسی لائحہ عمل کی ضرورت نہیں ہے روح کا جسم کے ساتھ تعلق رہنا اور نہ رہنا ایک واقعی کیفیت ہے جب تک روح ہے زندگی ہے، روح جدا ہوگئی مردہ ہوگیا۔

یہ مفہوم زندگی کا ایسا نہیں ہے کہ اس کو کسی حکیمانہ قانون کے تحت میں لایا جائے لیکن جس زندگی کے متعلق ہمیں کلام کرنا ہے وہ اس سے مختلف ہے، وہ زندگی ہر چیز کے لئے اس کے اعتبار سے ہے اور مختلف حیثیت رکھتی ہے۔

زندگی کا اس اعتبار سے کہ جو میں کہتا ہوں اتنا وسیع مفہوم ہے کہ جو دنیا کی تمام جاندار اور غیر جاندار چیزوں میں پایا جاتا ہے آپ صنف جمادات پر غور کیجئے تو ہر چیز میں ایک دور زندگی ملے گا۔ اور ایک دور موت ملے گا۔

جمادات کو دیکھئے زمین بے حس و حرکت چیز ہے، نہ نشو و نما کی صلاحیت ہے نہ انسانی خواہشیں، کچھ نہیں مگر ارباب عقل اور اہل شعور نے زمین میں بھی ایک حالت موت قرار دی اور ایک حالت زندگی، چاہے یہ نہ دیکھئے کہ زمین جاندار کب ہوتی ہے لیکن زمین زندہ ضرور ہوتی ہے اور زمین جو مدت تک خشک پڑی ہوئی ہو جس میں دانہ بویا نہیں گیا جس میں زراعت نہیں ہوئی وہ زمین مردہ زمین ہے پھر یہ زمین زندہ کیونکر ہوتی ہے؟

زندگی اس زمین کی اس طرح ہے کہ اس میں صلاحیت پیدا کی جائے دانہ کے روئیدہ ہونے کی، اس زمین کی اصلاح کی جائے اس کو سیر و سیراب کیا جائے۔ یہاں تک کہ اس میں نشو و نما بخشنے کی طاقت ہو اور اس میں نباتات روئیدہ ہوسکیں۔ آپ نے تخم پاشی کی اور زراعت کی تو اب وہ زمین زندہ ہے۔ قرآن مجید نے بھی اسی محاورہ میں اطلاق کیا ہے، ارشاد ہے:۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا.

ترجمہ: خدانے آسمان سے پانی برسایا تو زندہ کیا اس سے زمین کو جبکہ وہ حالت موت میں تھی۔

یعنی آب باراں کے چھینٹوں سے اور اس قدرتی آب پاشی کے ذریعہ سے یہ صلاحیت پیدا کی کہ دانہ کو روئیدہ کر سکے۔ اس طرح وہ زمین جو مردہ تھی زندہ ہوگئی، معلوم ہوا کہ زمین غیر جاندار چیز تھی لیکن ایک وقت میں وہ مردہ کہی جاتی ہے دوسرے وقت میں اسے زندہ کہتے ہیں۔

درخت ہے اور وہ زمین سے روئیدہ ہوا ہے اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، ابھی وہ تروتازہ ہے، اس میں برگ وبار لانے کی صلاحیت ہے۔ اس میں قابلیت ہے اسبات کی بہار کے زمانہ میں وہ سرسبز وشاداب ہو یہ اور بات ہے کہ موسم خزاں کے تغیرات کی وجہ سے وہ وقتی طور پر بے بار نہ ہو لیکن توقع ہے کہ جب خزاں کا دور گذر جائے گا بہار کا زمانہ آئے گا تو پھر یہ درخت سرسبز وشاداب ہو جائے گا، آپ اس درخت کو کہیۓ گا کہ زندہ ہے لیکن درخت اپنی زندگی پوری کر چکا، کہنہ ہو گیا کہنہ ہونے کی وجہ سے اس کی صلاحیت جاتی رہی، امتداد زمانہ کی وجہ سے پتے جھڑ گئے اور شادابی نہیں باقی رہی، بے برگ وبار ہو گیا اس میں ثمر آنے والے نہیں ہیں، اس میں سر سبزی پیدا ہونے والی نہیں ہے۔ آپ کہیۓ گا درخت مردہ ہو گیا، ایسے درخت جلانے کے کام آتے ہیں درخت جاندار تو نہ تھا لیکن اس کے لئے زندگی ہے اور موت ایک وقت میں زندہ ہے اور ایک وقت میں مردہ۔

پھول! پہلے غنچوں کی شکل میں تھے اس کے بعد کھلے، ابھی رنگ وبو باقی ہے مرجھائے نہیں ہیں یہ ان کی زندگی ہے، تھوڑی دیر میں ہوا کے جھونکوں اور تمازت آفتاب سے پھول مرجھا گیا پژمردہ ہو گیا پژمردہ کیا ہوا کہ مردہ ہو گیا، وہ تھا ان کا دور زندگی اور یہ ہے ان کا دور موت۔ حیوانات اور انسانوں میں بھی ایسا ہی ہے، آپ کہتے ہیں یہ زندہ ہے اور یہ مردہ تو یہ کون سی زندگی اور موت ہے جو غیر جاندار میں بھی ہے اور جاندار میں بھی؟

اب زندگی اور موت کا مفہوم ذرا مبہم ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ چیزیں جو جاندار ہوتی ہیں یعنی حیوانات، ان میں آسان تھا جب تک روح جسم میں موجود ہے ان کو ہم زندہ کہتے اور جب روح جسم سے نکلے تو کہتے ہیں مردہ ہیں۔

لیکن ان چیزوں میں جن میں کہ یہ ظاہری پردہ موت وحیات کا نہیں ہے جن میں نہ تو روح کبھی تھی اور نہ آئندہ آئے گی، ان میں زندگی اور موت کا مفہوم کیا ہے اس سے ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ درحقیقت موت اور زندگی کے معنی کیا ہیں؟ وہ معنی ہمہ گیر ہیں جن میں نباتات بھی داخل ہیں جمادات بھی داخل ہیں۔

اس موت وحیات کا کیا معیار ہے؟ یہ کیا ہے کہ زمین پانی سے سینچی جانے سے پہلے اور اس میں آب یاری اور زراعت ہونے سے پہلے زندگی نہ تھی اور اس کے بعد پیدا ہوگئی؟ زمین تو پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔ وہی شکل وصورت اب بھی ہے جو کچھ ہے وہی پہلے بھی تھا، زمین نہیں بدلی لیکن ہم اس زمین کو پہلے مردہ کہتے تھے اور اب زندہ کہنے لگے، درخت جس وقت سرسبز و شاداب تھا تب بھی وہ درخت تھا، اور اب بھی وہ درخت ہی ہے جبکہ وہ خشک ہوگیا ہے اور اسکی ٹہنیاں سب پژمردہ ہوگئی ہیں لیکن آخر یہ کیا ہے کہ کبھی ہم اس کو زندہ کہتے ہیں اور کبھی مردہ کہتے ہیں، یہ موت وزندگی کا مفہوم کیا ہے، یہ زندگی کونسی زندگی ہے جو بے جان ہونے کے باوجود ہوتی ہے اور یہ موت کونسی موت ہے جو پہلے سے بے جان ہونے کی حالت میں ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس موت وزندگی کا معیار روح کا تعلق اور عدم تعلق نہیں ہے یعنی اس موت کے معنی روح کا جدا ہونا نہیں ہیں تو بے جان چیز میں تو روح تھی ہی نہیں، اس میں زندگی اور موت کا مفہوم کہاں سے آیا جب بے جان چیز زندہ اور مردہ بن سکتی ہے باوجودیکہ اپنی بے جان حالت پر قائم رہے تو یاد رکھئے کہ جاندار چیز بھی زندگی اور موت سے متصف ہوسکتی ہے باوجودیکہ اپنی جاندار حالت پر باقی رہے، یہ زندگی کیا ہے اور یہ موت کیا ہے؟

اگر ہم نے اس زندگی اور موت کے معنی سمجھ لئے تو پھر ہمارے لئے آسان ہوجائے گا اس مشکل کا حل کہ انسان کی زندگی کیا ہے اور درحقیقت جینے کا مستحق قرار دے سکے۔ یہ زندگی جو ہر چیز میں پائی جاتی ہے اور یہ موت جس سے کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہے اس کا معیار جسم وروح کے باہمی تعلق کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ اب وہ معیار کیا ہے؟

میں آپ سے عرض کروں کہ قدرت نے ہر چیز میں اس کے حدود طبعی کے اندر کچھ صلاحیتیں مقرر کی ہیں کہ وہ شئے ان صلاحیتوں کے درجوں کو طے کرکے حد کمال تک پہنچ سکے

(میرے الفاظ محفوظ رکھئے) ہر چیز کے لئے صلاحیتیں مقرر ہیں، اور ہر صلاحیت کے اندر مختلف منازل اور مدارج ہیں جس طرح ایک چومنزلی عمارت ہو اس میں ہر منزل دوسری منزل سے علیحدہ ہے، ہر منزل دوسری منزل سے مختلف ہے، لیکن ہر منزل سے آگے بڑھنے کے لئے، دوسری منزل تک پہنچنے کے لئے بہت سے درمیانی زینے ہوتے ہیں جب ان کو طے کیجئے تب پہلی منزل سے دوسری منزل تک قدم پہنچے گا، در حقیقت یہ منزلیں جو مقرر ہیں انہیں تمام اشیاء کے حدود طبعی سمجھئے، یعنی عمارت کائنات ایک چومنزلہ عمارت ہے جس میں ایک منزل ہے جمادات کی، ایک نباتات کی، ایک حیوانات کی اور ایک انسان کی۔ یہ چومنزلہ عمارت ہے اور یہ منزلیں بجائے خود الگ الگ ہیں لیکن خود ہر منزل میں بھی مدارج ہیں پستی و بلندی کے، ہر منزل میں درجے، قدم آگے بڑھانے اور پیچھے ہٹانے کے پائے جاتے ہیں، بہت سے ایسے درمیانی منازل و مراحل ہیں جن کے طے کرنے سے آپ جس منزل میں تھے اسی منزل میں رہیں گے لیکن پھر بھی درجہ مختلف ہو جائے گا دس سیڑھیاں ہیں، نو سیڑھیاں طے کر جایئے، ترقی آپ نے ضرور کی، بلندی ضرور حاصل کی، مگر یہ بلندی ابھی پہلی ہی منزل تک محدود ہے دوسری منزل تک نہیں پہنچی، بیشک وہاں ایک خط فاصل ہوگا، اگر اس خط فاصل سے قدم آگے بڑھا لیا جائے تو دوسری منزل میں پہنچ گئے، کائنات میں ایسے ہی مدارج ہیں۔

جماد جماد ہے، نبات نبات ہے، حیوان حیوان ہے، تو کیا اس کے لئے ترقی کے دروازے مسدود ہیں؟ نہیں جمادات، جمادات کی حد میں رہتے ہوئے بھی ترقی کا راستہ رکھتے ہیں، نباتات، نباتات کی حد میں قائم رہتے ہوئے بھی ترقی کی منزلیں اپنے لئے رکھتے ہیں، حیوان حیوانات کی حد میں رہتے ہوئے بھی منازل ترقی رکھتے ہیں اور انسان، انسان رہتے ہوئے بھی مدارج ترقی پر فائز ہو سکتا ہے۔

یہی وہ ہے جو میں نے مختصر طور پر عرض کیا تھا کہ ہر شئے کے لئے اس کے حدود طبعیہ میں منازل ہیں کہ وہ جب ان کو طے کرے تو حد کمال تک پہنچ جائے۔

قدرت نے اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جب تک کسی شئے کے پاؤں میں آگے بڑھنے کی طاقت رہے گی، وہ زندہ رہے گا، جب اس کے پیروں کی طاقت جواب

دے دے یعنی صلاحیتیں اس کے آگے بڑھنے کی ختم ہو جائیں، یہ اس کی موت ہے دوسری لفظوں میں یوں عرض کردوں کہ درحقیقت جب تک کسی شئی میں قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ صلاحیتیں کارفرما ہیں اور وہ شئے ان درجوں کو طے کر رہی ہے وہ زندگی کے دور میں ہے اور جب وہ اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھے، اس کی رفتار ختم ہو جائے تو وہ شئے مر گئی، مردہ ہو گئی، اس کو آپ نے مردہ کہا اس وقت جب اس میں وہ صلاحیت جو ترقی کی ہونا چاہیے کارفرما نہ تھی، آپ اگر اس میں دانہ بو دیتے تو فنا ہو جاتا۔ اسلئے کہ زمین میں قابلیت نہ تھی اس جوہر خاص کو ظاہر کرنے کی جو قدرت نے زمین کے لئے قرار دی ہے۔ زمین کی صفت قدرت نے کیا قرار دی ہے؟ اس کی صفت یہ ہے کہ وہ گہوارہ بنے نباتات کی پرورش کا، اور نباتات اس میں پرورش پائیں، ظاہر ہوں یہ درحقیقت صف کمال ہے زمین کے لئے جب تک یہ صفت اس سے دور تھی اور یہ صلاحیت اس میں فعلاً موجود نہ تھی آپ نے کہا کہ مردہ۔

جب آپ نے زمین میں وہ قابلیت پیدا کر دی کہ اب اگر دانہ بویا جائے تو وہ اس کو صحیح طور سے پرورش کر سکے۔ تب آپ نے کہا کہ زمین زندہ ہے مگر بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ کبھی ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، ان کی موت دائمی موت ہوتی ہے جیسے بعض عارضے ہوتے ہیں لاعلاج اسی طرح اگر زمین میں ایسا مرض پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے میں دانہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ زمین زندہ نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح درخت کو قدرت نے صفت کمال یہ عطا کی ہے کہ اس میں نشوونما ہو، وہ بڑھے اور پربار ہو، جب تک یہ صفت پائی جاتی ہے وہ زندہ ہے جب یہ صفت رخصت ہو گئی تو موت آ گئی۔

پھول میں قدرت نے رنگ و بو عطا کیا ہے، جب تک رنگ و بو باقی ہے آپ نے کہا زندہ ہے جب یہ صفت کمال الگ ہو گئی آپ نے کہا مردہ ہے تو اب درحقیقت قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کا مصروف عمل ہونا یہ ہوئی زندگی اور قدرت کی صلاحیتوں کا فنا ہو جانا کسی شئے کا میدان عمل میں بے حس اور شل ہو جانا یہ درحقیقت اس کی موت ہے۔

انسان کی زندگی

جب آپ نے زندگی اور موت کا یہ معیار سمجھ لیا، تو آپ کو یہ دیکھنا ضرور ہوگا کہ انسان کی زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے کیونکہ ہم نے موت اور زندگی کے معنی اچھی طرح سے سمجھ لئے ہیں۔ جمادات میں آپ نے آسانی سے حکم لگا دیا۔ نباتات میں بھی آسانی سے حکم لگا دیا۔ لیکن انسان میں زندگی اور موت کا حکم لگانا کچھ آسان نہیں ہے اس لئے کہ ابھی تک آپ انسان ہی کو نہیں سمجھ سکے کہ وہ ہے کیا؟ آپ اگر انسان کو سمجھ لیتے تو آپ کو حکم لگانا کچھ آسان ہو جاتا لیکن جس وقت تک کہ انسان کو ہم سمجھتے ہی نہیں اس وقت تک ہم کیسے سمجھیں کہ انسان کی زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے؟ اس لئے کہ زندگی کسی نہ کسی طرح موجود رہنے کا نام نہیں ہے درحقیقت اس عالم کائنات میں ہر چیز کسی نہ کسی صورت سے باقی رہتی ہے، شکل بدل جاتی ہے ہیئت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، ایک شعلہ جس کو آپ نے خاموش کر دیا، وہ آپ کی نظر ظاہری سے گم ہو گیا لیکن آپ کو کیا معلوم کہ اس کے اجزاء اب بھی دامن ہوا میں موجود ہیں، یہاں تک کہ وہ چیزیں کہ جو درحقیقت ہماری نظر ظاہری میں بالکل فنا پذیر ہیں اور ان کا وجود کسی طرح سے باقی نہیں ہے، یہاں تک کہ ذہن سے نکلی ہوئی آواز اتنا بے ثبات وجود کہ جب تک پہلا جزو عالم وجود سے ہٹ نہیں جاتا دوسرا جزو صفحہ ہستی پر قدم نہیں رکھتا اس سے زیادہ بے ثبات وجود کسی چیز کا نہیں ہے لیکن آپ کو کیا معلوم کہ وہ بھی دامن میں ہوا کے ٹکراتی ہوئی میدان سفر میں گامزن ہے اور کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ اس کے وجود کا ثبوت یہ ہے کہ ایک جگہ کی آواز دوسری جگہ سنائی دیتی ہے اگر اس کا وجود کسی عالم میں نہ رہتا تو دوسری جگہ تک پہنچتی کیونکر؟

سفر تو اس چیز کا ہوتا ہے جو وجود رکھتی ہو، کوئی خط ہو تب تو مرسل الیہ تک پہنچے، اسی طرح اگر دہن سے نکلی ہوئی آواز لبوں سے جدا ہو کر فنا ہو جاتی تو ہوا کی سفارت سے سامعہ تک کون پہنچاتا۔ کوئی چیز دنیا کی اس نظام عالم میں فنا نہیں ہوتی، کسی وقت کسی شکل میں، کسی وقت کسی شکل میں، اگر زندگی کے معنی کسی چیز کے رہنے کے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز مردہ ہوتی ہی نہیں لیکن حقیقتاً زندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو خصوصیات اس کے ہیں وہ موجود رہیں۔

نباتات: میں نے عرض کیا اس وقت بھی موجود تھے جب ان میں بار آور ہونے کی

صلاحیت نہیں رہی لیکن آپ نے کیوں مردہ کہہ دیا اس لئے کہ درخت موجود تو ہے مگر جو درخت کی صفت یعنی نشوونماوہ باقی نہیں رہی۔

حیوان: جس وقت کہ روح اس کے جسم سے مفارقت کر گئی تب بھی تو موجود ہے، اس کا جسم بے جان ابھی تو آپ کے سامنے موجود ہے اس کی روح بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے تو پھر آپ اس حیوان کو کیوں مردہ کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ حیوان حیوان ہونے کی حیثیت سے باقی نہیں رہا، اگر آپ کو انسان کے زندہ ہونے کی تلاش ہے اگر آپ انسان کی حیات چاہتے ہیں تو انسان انسان ہونے کی حیثیت میں باقی رہے تب زندہ کہا جائے گا لیکن اگر انسان مثل حیوانات کے ہو کر باقی رہا تو زندہ تو ہے مگر انسان باقی نہیں رہا۔

اسی لئے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ اگر ہم انسان کی زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے ہم انسان کو سمجھیں کہ انسان ہے کیا؟ جب تک انسان کو نہ سمجھیں اس وقت تک ہم انسانی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے، یہ ظاہری آثار زندگی جو ہیں وہ تو حیوانات میں بھی ہیں۔

اطباء نے انسان کی زندگی کو جانچنے کے جو طریقے ایجاد کئے ہیں۔ آئینہ کو سامنے رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ سانس کا نشان ملتا ہے یا نہیں سینہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا جاتا ہے نبض کی حرکت سے پتہ چلایا جاتا ہے۔

مگر یاد رکھئے کہ یہ سب چیزیں حیوانی زندگی کے تشخیص کرنے کی ہیں یہ تمام ذرائع ایسے ہیں جن سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ انسان بحیثیت حیوان کے زندہ ہے۔

لیکن انسان کی بحیثیت انسان زندگی اس کے لئے یہ تمام ظاہری ذرائع بیکار ہیں اس کے لئے کوئی اور نبض ہونا چاہیے، اس کے لئے کوئی اور آئینہ ہونا چاہیے، اس میں یہ دیکھنا چاہیے کہ درحقیقت انسان بحیثیت انسان زندہ ہے یا نہیں، اس کے لئے ضرورت ہے اسبات کی کہ ہم یہ سمجھیں کہ انسان کیا چیز ہے، جب ہم انسان کو سمجھ لیں گے کہ کیا چیز ہے، اس وقت یہ مشکل حل ہو جائے گی کہ درحقیقت انسانی زندگی کس چیز کا نام ہے۔

انسانی نقطہ خیال مختلف ہو گئے ہیں کہ انسانی زندگی کیا چیز ہے جس کا باعث یہی ہے کہ انسان کی حقیقت کو ہی ہم ابھی نہیں سمجھ سکے اگر انسان کی حقیقت کو سمجھ لیتے تو مشکل حل ہو جاتی۔

انسان کی حقیقت

حقیقت انسان کا سمجھنا ایک دشوار گذار مرحلہ ہے بات یہ ہے کہ انسان مجموعہ عالم کائنات ہے دنیا میں جتنے مرتب اجناس خدا نے خلق کیے ہیں ان تمام اجناس کا مجموعہ ذات انسان کو قرار دیا ہے، انسان کے علاوہ تمام انواع کو دیکھئے ہر ایک میں جو صفت کمال نظر آئے وہ انسان میں موجود ملے گی اور اس پر اضافہ ہوگا۔

انسان میں جماد کا کمال بھی ہے یعنی وہ جوہر جو جماد میں پایا جاتا ہے وہ انسان میں بھی ہے بے شک جماد میں اس کے آگے اور کمالات کا فقدان ہے انسان اس نقص سے بری ہے۔

اس کے بعد نبات میں جو خصوصیات کمال ہیں وہ بھی انسان میں پائے جاتے ہیں پھر حیوان میں جو خصوصیات ودیعت کی گئی ہیں وہ سب انسان میں پائے جاتے ہیں اور انسانی خصوصیات ان پر اضافہ ہیں جس طرح کسی چیز کی روح نکالی جاتی ہے۔لب ولباب لے لیا جاتا ہے اسی طرح سے جمادات میں ایک پہلو کمال کا تھا، دوسرا پہلو نقص کا، نقص جمادات کا ان کے ساتھ چھوٹا، صفت کمال تھی جو کھینچ کر نباتات میں آئی، اس صفت کمال میں قدرت نے اضافہ کر کے نباتات کے نوع کی تشکیل کی، پھر نوع نباتات میں ایک پہلو کمال کا تھا، اور ایک نقص کا، کمال کا پہلو قدرت نے (جو نباتات میں تھا) جدا کرلیا اور معائب کو چھوڑ دیا، نباتات کے معائب نباتات کے دامن میں اور کمالات کھینچ کر حیوانات میں آئے، یہاں کچھ اور اضافہ ہوا خصوصیات میں جس سے جنس حیوانات کی تشکیل ہوئی، قدرت نے نقص حیوانی کو حیوان میں رکھا مگر اس کی صفت کمال کو لے لیا۔

ان صفاتِ کمال میں ترقی عطا کر کے اور کچھ اور جوہروں کا اضافہ کر کے نوع انسان کی تشکیل کی، اس طرح درحقیقت انسان مجموعہ کمالات نوع امکان ہے، اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں جس قدر زیادہ اجناس کی شرکت ہوئی اتنا ہی اس کی حقیقت میں ابہام پیدا ہوتا گیا اور یہ کلیہ جتنے اجزا زیادہ ہوں گے اتنی ہی دشواری سمجھنے میں ہو جائے گی۔

جمادات کے کمال کا دائرہ محدود اور دامن مختصر تھا ان کا سمجھ لینا آسان، قدم آگے بڑھایا،

نباتات کا درجہ آیا، یہاں ذرا باب وسیع ہو گیا اسرار و رموز مخفی تر ہو گئے، اس میں بہ نسبت جمادات کے خصوصیت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ آج یہ مسئلہ علمی دنیا کا ایک مہتم بالشان محل اختلاف قرار پا گیا کہ نباتات میں بھی حس و شعور ہے یا نہیں۔

اس کے بعد حیوان کی نوبت آئی اور جب یہ نقطہ ارتقاء حیوان سے بلند ہو کر انسان تک پہنچا تو اب جتنے اجزاء تھے عالم امکان کے مخلوق میں وہ تمام اجزا انتہی پر پہنچ کر انسان میں مجتمع ہوئے، اب یہ انسان مجموعہ اجزائے کمالات ہو گیا مگر اس کی حقیقت مخفی سے مخفی تر ہو گئی۔

اصلی رُخ تصویر کا نظر سے اوجھل ہوا نگاہ نے غلطی کی، رائے قائم کرنے میں دھوکا ہو گیا، انسان؟ وہی ''جسم'' بھی ہے وہی ''نامی'' بھی ہے وہی ''حیوان'' بھی ہے۔ ''حیوان'' کے معنی جانور کے نہیں، جاندار کے ہیں، اور انسان تو وہ ہے ہی کوئی انسان کو بھی بحیثیت جسم دیکھنے لگتا ہے کبھی بحیثیت نامی اور کبھی بحیثیت حیوان یہ بہت کم ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان دیکھا جائے۔

وہ لوگ کم سہی جو بحیثیت جسم یا بحیثیت نبات دیکھتے ہیں مگر وہ لوگ بہت کم ہیں جو انسان کو بحیثیت انسان دیکھتے ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ جو ذرائع دریافتِ حیات کے مقرر کئے گئے ہیں وہ سب انسان کی حیوانی زندگی کی تشخیص کرنے کے ہیں۔ انسانی زندگی کی تشخیص اطباء کے امکان سے خارج ہے علماء یونان و فرنگ کی قدرت سے باہر ہے کہ وہ انسان اور انسانی زندگی کی تشخیص کر سکیں، انسان اگر انسانی حدود میں ایک مادی چیز ہوتا تو بے شک مادی ذرائع سے اس کی حیات اور موت کو آپ دریافت کر لیتے، لیکن یاد رکھئے کہ انسان بحیثیت انسان مادی چیز نہیں ہے۔ انسان بحیثیت انسان جسم نہیں رکھتا، وہ آپ کی نظر کے سامنے نہیں ہے، آپ آئینہ میں صورت دیکھتے ہیں جسم نظر آتا ہے انسان نہیں نظر آتا، آپ جو چیز حس ظاہری سے دیکھ لیتے ہیں وہ بہت پست تر جوہر کمال ہے انسان کا یعنی ''جسمانیت'' اس کو آپ حواس ظاہری سے دیکھ کر پتہ اس کا لگا سکتے ہیں۔ لیکن ایک ذرا قدم آپ کا آگے بڑھا اور آپ کے حواس ظاہری بے کار ہو گئے۔

آپ آئینہ میں جس وقت اپنے تئیں دیکھتے ہیں یا نگاہ سے دوسروں کو دیکھتے ہیں تو آپ کو انسان بحیثیت نشو و نما کب دکھائی دیتا ہے۔

درخت کو آپ دیکھتے ہیں مگر درخت کا نمو آپ کی آنکھ دیکھ لے ناممکن ہے، درخت میں بھی آپ کو جسمیت نظر آتی ہے نمو نہیں نظر آتا، معلوم ہوا کہ سب سے پہلا قدم سعی جو میدان کمال میں انسان کا پڑا، وہ ہے آپ کے حسن ظاہری سے بلند ہو گیا، آپ کا حس ظاہری صرف جمادات کے حد کمال تک منحصر ہے اس کے بعد ادھر قدم آگے بڑھا، اور ''نامی'' کی حد میں انسان پہنچا اور آپ کے حواس بے کار ہو گئے، آپ صبح سے شام تک کسی درخت پر نگاہ جمائے ہوئے رہیے۔ لیکن اسے بحیثیت ''نامی'' آپ کبھی نہ دیکھے گا، ہمیشہ جسم نظر آئے گا اور بس۔

آپ کا بچہ آپ کے آغوش تربیت میں پرورش پاتا ہے، کون کہتا ہے کہ نہیں بڑھتا؟ ہر منٹ میں بڑھتا ہے، ہر سکنڈ میں بڑھتا ہے لیکن کوئی بڑھنے کو اس کے دیکھے؟ ناممکن۔ معلوم ہوا کہ سب سے پہلا قدم کمال جو انسان طے کرتا ہے یعنی اس کا نشوونما، یہی آپ کے حسِ ظاہری سے باہر ہے۔

اس کے بعد حیوانات کا درجہ آتا ہے اس کے حس و حرکت ارادیہ کو دیکھ سکیں چھو سکیں، حواس ظاہری احساس کر سکیں، غیر ممکن ہے۔ اب اس کے بعد کہیں انسانیت کا درجہ ہے تو آپ کی نظر جو کچھ اندازہ کر سکتی ہے وہ اس کی سب سے پہلی صفت یعنی ''جسمیت'' ہے اس کا احساس آپ کر سکتے ہیں وہ بھی میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل سطحی نظر سے ہے لیکن اگر ذرا باریک نگاہ ڈالیں تو یہ معلوم ہوگا کہ جسمیت کا بھی احساس آپ کی نگاہ نہیں کر سکتی بلکہ صرف ظاہری لون اور شکل ہے جس کا نگاہ کو احساس ہوتا ہے۔

لیکن یہ جز عام افراد کی فہم سے بالاتر ہے، میں ظاہری حیثیت سے اتنا ہی کہتا ہوں کہ جسمیت وہ چیز ہے جس کا ہماری نظر احساس کرتی ہے اس کے آگے جسم نامی کا کمال ہم کو نظر نہیں آتا، حیوانیت کا کمال ہم کو نظر نہیں آتا، چہ جائیکہ انسانیت کا کمال، اس سے ایک اور نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنے حس ظاہری میں اتنی قوت پیدا کیجئے کہ جو خدا کی مخلوق ہے اس کے کمالات کا اپنی حس ظاہری سے پتہ چلائیے تب یہ خیال کیجئے کہ شاید خداوند عالم کا حس ظاہر سے مشاہدہ ہو جائے، اس کی مخلوق کو آپ دیکھتے ہیں مگر حقیقتاً ان کو نہیں دیکھتے پھر جسے آپ دیکھتے ہیں جب اسے آپ نہیں دیکھ سکتے تو اس کو کیسے دیکھ سکتے ہیں جس کو دیکھا ہی نہیں، انسان پردہ خفا میں ہے،

اس کو کیونکر سمجھیں کہ وہ کیا ہے۔ سب سے قریب اپنی صورت یعنی اپنے سے زیادہ قریب کوئی نہیں لیکن یہی قرب سبب خفا بن گیا یعنی دوسروں کو دیکھ بھی لیتے ہیں لیکن اپنے تئیں بغیر کسی مادی چیز کی مدد کے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

آئینہ لگایئے، شیشہ پر جلا کیجئے، وہ جز قرار دیجئے، ایک لطیف اور ایک کثیف، تب چہرہ نظر آئے گا، جب اپنے دیکھتے ہیں ذریعہ کے محتاج ہیں اس لئے کہ ہم اپنے سے بہت قریب ہیں تو جو ہم سے رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے اس کو ہم نظر ظاہری سے کیونکر دیکھ سکتے ہیں۔ بے شک اس کو آئینہ کی ضرورت ہے اور جس طرح ایک آئینہ میں دو رخ ہوتے ہیں ایک کثیف اور ایک لطیف، اسی طرح واسطہ ہونا چاہیے، جس میں دو پہلو ہوں ایک مادیت کا اور ایک روحانیت کا۔

بہر حال! جمادات کو سمجھ لیا، نباتات کو سمجھ لیا، حیوانات کو سمجھ لیا، دنیا کے ذرے ذرے کو چھان ڈالا لیکن اپنے ہی تئیں نہیں سمجھا کہ ہم کیا ہیں انسان کو کسی نے دیکھا جسمانی اعتبار سے کسی نے نشوونما کے اعتبار سے کسی نے حیوانی اعتبار سے اگر انسان نام ہے صرف اجزائے مادی کے اجتماع کا ایک جو خاص شکل پر مجتمع ہو کر ایک جسم کی تشکیل کرتے ہیں تو یہ انسان حقیقتاً انواع کائنات میں کوئی ممتاز درجہ نہیں رکھتا، اس لئے کہ جتنے صفات اس حیثیت سے پائے جاتے ہیں، ان حیثیتوں سے انسان تمام موجودات کائنات میں اکثر سے پیچھے ہے عظمت جسمانی کو لیجئے تو انسان پہاڑ کے مقابلہ میں کب آسکتا ہے، اگر نشوونما کو لیجئے تو وہ چیزیں جن میں نشوونما انسان کے بہ نسبت زیادہ سرعت سے ہوتا ہے وہ انسان سے آگے ہیں، پورا درخت کا جتنا جلد جلد کمال تک پہنچتا ہے اتنے جلد انسان نہیں پہنچتا، ماننا پڑے گا کہ صفت نشوونما میں درخت زیادہ کمال رکھتا ہے انسان اس سے کم ہے بحیثیت احساسات ظاہری، باصرہ، لامسہ و شامہ وغیرہ۔ بہت سے ایسے جانور ملیں گے جن کے یہ احساسات انسان سے زیادہ تیز ہیں، تو پھر انسان اشرف المخلوقات کیونکر ہوا؟

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ترقی یافتہ فرد سلسلہ کائنات میں کیونکر ہے جبکہ اس کی تمام قوتیں جو حیوانی حیثیت سے پائی جاتی ہیں اکثر حیوانوں سے کم ہیں۔ مجھے یہ فلسفہ کوئی سمجھائے کہ ترقی ہونے سے قوت بڑھ جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے، اگر انسان درحقیقت جداگانہ

نوعیت نہیں رکھتا تو کوئی بتلائے کہ وہ احساسات جو کسی دوسرے حیوان میں پائے جاتے ہیں وہ یہاں پہنچتے ہی کمزور کیونکر ہو گئے، اگر انسان درحقیقت کسی حیوانی جسم کا نام ہے تو سب سے اشرف نہیں ہے بلکہ پست ہے، بہت سی چیزوں سے دنیا کی، پھر اگر انسان حقیقتاً اشرف ہے تو آپ کو کوئی جوہر ماننا پڑے گا جو جسمیت کے علاوہ ہو جو نشو ونما کے علاوہ، جو حس وحرکت کے علاوہ ہو، جو انسان میں ہو دوسروں میں نہ ہو۔ اس لئے کہ اشرف ہے، اگر انسان درحقیقت عناصر کے اجتماع کا نام ہے تو حقیقتاً انسان کی زندگی کیا ہوتی؟ انہی عناصر کے اجتماع کا قائم رہنا اور انسان کی موت کیا ہوتی؟ انہی عناصر کا منتشر ہو جانا، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشان ہونا

لیکن اگر انسان حقیقتاً کوئی اور چیز ہے تو اس کی زندگی کچھ اور ہوگی اور موت کچھ اور ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ قدرت نے انسان اور دوسرے حیوانات میں ایک خاص امتیاز اور تفرقہ قرار دیا ہے، دوسرے حیوانات ایسے ہوتے ہیں کہ شکم مادر سے نکلتے ہی ان کی حس وحرکت کمال پر ہوتی ہے، حیوانات کے بچے محتاج نہیں ہوتے کہ جب بڑے ہوں تب ان میں حس وحرکت وارادہ پیدا ہو بلکہ اس حیثیت سے کوئی تفرقہ ان میں باعتبار منازل عمر کے نہیں ہوتا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا بچہ جس وقت شکم مادر سے متولد ہوتا ہے تو اس کے تمام احساسات بے کار و معطل ہوتے ہیں، آنکھ ہوتی ہے مگر ٹھہرتی نہیں، ہاتھ ہوتے ہیں مگر ارادہ کے تابع نہیں، قابو میں نہیں ہوتے، اٹھتے کسی پر ہیں اور پڑتے کسی پر ہیں، پاؤں ہوتے ہیں مگر چلنے کی طاقت نہیں ہوتی، حرارت وبرودت کا حس بھی مشکل سے ہوتا ہے یہ آخر کیا ہے؟ دوسرے حیوانوں کے بچے تمام قوتوں کے مالک ہوتے ہیں مگر انسان کا بچہ تمام قوتوں سے تہی دست ہوتا ہے یہ درحقیقت رد ہے نظریہ ارتقاء کی۔ اگر ترقی کا فلسفہ درست ہوتا تو کل قوتیں پوری قوت کے ساتھ آتیں اور اس کے بعد ان میں اضافہ ہوتا لیکن انسان میں قوت کا معدوم ہونا اور رفتہ رفتہ آنا یہ بتلاتا ہے کہ اس کی ابتدا بھی یہیں سے ہے اور انتہائی ترقی بھی یہیں ہے یہ جو کچھ کمال حاصل کرتا ہے وہ پس ماندہ اموال کی طرح نہیں کہ جو مورث اعلیٰ سے اس کے ہاتھ میں آتا ہو بلکہ جتنے

کمالات ہیں وہ اس کی ذاتی طاقت وقوت کے نتائج ہیں، وہ اپنی موجودہ طاقت سے ہی آگے بڑھتا ہے اور حد کمال تک پہنچتا ہے، بے شک انسان سلسلہ ارتقاء میں آتا ہے، میں بھی اس کا قائل ہوں یعنی جمادات سے بڑھ کر انسان تک پہنچتا ہے، خالق کائنات نے جو نظام قرار دیا ہے اس کی بنا پر دانہ زمین پر بویا جاتا ہے تو زمین کے ذرات ہی ہوتے ہیں جو رطوبتوں کو جذب کر کے فیض مجاورت سے نبات کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

اس کے بعد "جسم نامی" کہ جو شجر پر بار مختلف قسم کی گیاہ کی شکل میں ہوتا ہے وہی جز ہوتا ہے جسم حیوانیات کا، جو چیزیں فضلات میں سے ہوتی ہیں وہ علیحدہ ہو جاتی ہیں اور جو جو ہر ہوتا ہے وہ خون میں تبدیل ہو کر جسم میں دوڑتا ہے اور نبات تھا جواب ترقی کر کے جسم میں حیوان کا جزو ہوتا ہے۔

اس کے بعد حیوانات سے تغذیہ ہوا اور وہ جسم انسان کا جزو ہوئے یعنی ان کے گوشت سے انسان کی غذا حاصل ہوئی، خون صالح پیدا ہوا، اس سے انسان میں اس جوہر خاص کی خلقت ہوئی جس سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے۔ کیا ہوا؟ بے شک یہ ہوا کہ جماد ترقی کر کے انسان کے درجہ تک پہنچا۔ لیکن انسان کے درجہ تک نہیں، جسم انسان کے درجے تک پہنچا، یہ سب منازل جسم انسانی کی ساخت تک ختم ہو جاتے ہیں اور جسم انسانی کی ساخت وہی ہے جس کو قدرت نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے:۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ.

ہم نے انسان کو مٹی کے پتلے کی صورت سے پیدا کیا۔

یہ سب سے پہلی مرتبہ کی خلقت یعنی خلقت آدم کا ذکر ہے جس سے ہمیں مطلب نہیں:۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ.

اس کے بعد ہم نے یہ نظام قرار دیا کہ اس کو ہم نے نطفہ بنایا اور قرار دیا ایک پر سکون استقرار کی جگہ (بطن مادر) میں۔

فَخَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً.

یہ جسم انسان کی ساخت کی ترکیب بیان ہو رہی ہے کہ "ہم نے اس نطفہ کو علقہ کی شکل

میں تبدیل کیا"

فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً.

پھر ہم نے اس علقہ کو ایک گوشت کی ٹکڑے کی شکل میں تبدیل کیا۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا.

اس گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تیار کیا اور اس پر ہم نے باریک گوشت کا غلاف چڑھا دیا۔

یہ تمام مدارج وجود جسم انسانی ہیں، منزل تیار ہو رہی ہے مکین نہیں بن رہا ہے گھر تیار ہو رہا ہے رہنے والا اتارا جائے گا قفس کی ساخت ہے بلبل سدرہ نشین اس کے علاوہ ہے یہ نہ سمجھے گا کہ انسان بن رہا ہے ہیکل انسانیت تیار ہو رہی ہے، اطباء کو جو نسخہ عزیز ہوتا ہے دوسروں کو بتاتے نہیں ہیں مگر کتنا مقتدر ترکیب دینے والا ہے کہ نسخہ لکھ کر پیش کر دیتا ہے، ترکیب بھی بتا دیتا ہے، ترتیب بھی بتا دیتا ہے اگر ہاتھوں میں دم ہو بنالو، مگر اس کے بعد نہیں معلوم کون سی عزیز سے عزیز تر چیز تھی جسے بتانے پر تیار نہیں ہے، سب کچھ بتا دیا، اگرچہ پردہ کی بات تھی، بنایا تھا حجاب کے اندر مگر بتانے میں کوئی عذر نہیں کیا لیکن اب یہ معلوم کون سا پردہ ہے کہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، منزل قریب آگئی تھی۔ دنیا مشتاق تھی، عالم جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیا ہے؟ امیدیں بندھ گئی تھیں، اس لئے کہ سیاق کلام امید افزا تھا، اس وقت قدرت مصروف اظہار تھی بیان ہو رہی ترکیب ساخت انسانی تفصیل کے ساتھ، کوئی جز چھوڑا نہیں جاتا جتنی کڑیاں ہیں، ایجاد کی سب بیان ہو رہی ہیں ابتدا بھی بتائی وسط بھی بتایا، آخر میں بتایا، سب کچھ بتایا، یقین ہو گیا کہ جو پوچھنا چاہتے تھے وہ معلوم ہو جائے گا لیکن نقطہ قلم بیان اس غلاف کی تکمیل تک، یا اس پردہ تک جو اس محل وجود انسانی پر چڑھ گیا تھا آ کر منتہی ہو گیا۔

اس حجاب قدس میں آ کر اترے گا کون؟ کون ہے اس منزل کا مکیں؟ وہ معلوم ہونے کی دیر ہے لیکن یہاں تک پہنچتے ہی انداز کلام بدل گیا تفصیل ابہام کی طرف منتقل ہو گئی، پردہ ڈال دیا گیا:۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ.

پھر ہم نے اسے کچھ اور بنا دیا۔

یہ کچھ اور کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس کی ابتدا ہی ہم کو نہیں معلوم اور انتہا بھی ہم نہیں جانتے، وہ وہی ہے جو کچھ اور ہے۔

"اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ" عجیب لفظ استعمال کی ہے اس کے پہلے یہ تھا:۔

خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا.

ہم نے اسے یوں بنا دیا، یوں کر دیا، اس سے پتہ چلتا تھا کہ کچھ تھا اور اسی کی کچھ حالت میں تبدیلی ہوئی یعنی ایک ہی شئے پر دوسری کیفیت طاری کی گئی، نطفہ تھا اسی نطفہ کا علقہ بن گیا اس کو مضغہ بنایا مضغہ میں ہڈیاں پیدا کی گئیں۔

لیکن اب الفاظ بھی بدلتے ہیں:۔

"خلقنا" نہیں کیا "انشانا" کہا گیا۔ جس سے پتہ چلا کہ یہ چیز وہ ہے جو اپنے ماقبل سے بالکل اجنبی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس جسم میں کچھ انقلاب ہوا ہو، اور یہ چیز تیار ہو گئی ہو، بالکل نہیں۔ یہ "انشاء" ہے، یہ قرار دینا نہیں ہے، یہ کسی شئے کو کوئی شئے بنانا نہیں ہے بلکہ ایجاد کرنا ہے "نیست" کو "ہست" کرنا ہے۔

یہ کچھ اور ہی ہے امیدیں قطع ہو گئیں، نہیں بتایا گیا کہ یہ کیا ہے۔ سب کچھ بتا دیا، مگر یہاں آ کر سہارا قطع کر دیا گیا، پھر کیا کیا جائے دل کی بے چینی کو، بے پوچھے نہیں بتایا تو اچھا پوچھ لیں، شاید معلوم ہو جائے، پوچھا گیا مگر یہ بتانا ہوتا تو بے پوچھے ہی کیوں نہ بتا دیتا، وہ دنیا کو معلومات کی بارش سے فیضاب بنانے والا، وہ اگر بتانے میں مصلحت سمجھتا تو بے پوچھے کیوں نہ بتا دیتا، دل کی بے چینی نے سوال کیا

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ.

وہ مبداء حیات انسانی، روح! کیا چیز ہے؟

وہ ایک چیز ہے جس کے لئے اس کے مختلف اعراض کی وجہ سے مختلف نام ہو گئے، کبھی نفس کہہ دیا کبھی "روح" کہہ دیا کبھی عقل کہہ دیا۔ وہ ایک ہی چیز ہے جیسے اس کا خالق حضرت احدیت ہے اسے کسی صفت کو دیکھ کر "قہار" کہہ دیا، کسی صفت کو دیکھ کر "جبار" کہہ دیا کسی صفت کے لئے

"رحمان" کہہ دیا ہے ایک ہی صفات کا مجموعہ نہیں ہے، صفتیں اس کی ذات میں داخل نہیں ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان صفتوں کو ہم نے جان بھی لیا تو اس کو باطل نہ جانا، مگر اس کے آثار و رحم و کرم مختلف آثار کو دیکھ دیکھ کر ہم نے مختلف اوصاف قرار دے لئے اور انہی سے ہم اسے جانتے ہیں ۔روح انسانی میں بھی یہی صورت ہے کہ کسی اثر کو دیکھ کر عقل کہہ دیا، کسی کو دیکھ کر نفس کہہ دیا، کسی کو دیکھ کر روح کہہ دیا، آثار کو دیکھ کر نام رکھ لئے، مبدأ حیات ہے اس لئے روح کہا، صاحب درک ہے اس لئے عقل کہہ دیا، مدبر جسم ہے اس لئے نفس کہہ دیا، پھر بھی اسے نہیں جانا جس کے یہ سب نام رکھ دئے اس لئے پوچھا "یہ روح کیا ہے؟" خاطر شکنی منظور نہ تھی کہ جھڑک دیا جائے، روک دیا جائے، بتایا گیا مگر بتایا گیا تو اس طرح کہ اگر سمجھ ہو تو سمجھے۔ یہ ارشاد ہوا:۔

قُلِ الرُّوحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ

روح میری خدا کی ایک بات ہے۔

بس! روح کو کون سمجھے، خاموش تو ہو گئے سب اسلئے کہ بتانے میں عذر نہیں کیا گیا، لیکن سمجھا کون؟

حقیقتاً پردہ کی بات پردہ میں رہی، وہ سب کیوں بتا دیا گیا۔ اور انسان کی حقیقت کیوں نہ بتائی گئی؟ جواد و کریم خدا اس کو بخل سے کیا علاقہ پھر بتانے میں کیا حرج تھا، کیوں پردہ ہی میں رہنے دیا گیا؟

اس لئے کہ انسان انسان رہے، اگر بتا دیا جاتا تو مقصد فوت ہو جاتا، انسان کی انسانیت کا جوہر گم ہو جاتا، خود اختیاری علمی و عملی ترقی یہی سب سے انسان کو امتیاز حاصل ہوا ہے اور پھر ایک اور صنف بڑی معزز و محترم صنف یعنی صنف ملائکہ، اس سے بھی انسان کو اشرف قرار دیا گیا کیا بات تھی یہ انسان! اس میں کیا صفت تھی کہ سب سے ممتاز قرار دیا دے گیا۔ مجھ کو یہی تو بیان کرنا تھا مگر ابھی تک نہیں بیان کر سکا، جس کے لئے فکروں اور عقلوں نے اتنی ٹھوکریں کھائیں، یہ کیا چیز ہے؟ جس کے لئے سوال کیا۔ اتنی مرتبہ ناکامی اٹھانا پڑی، یہ انسان کیا ہے؟ یہ انسان جوہر قدس وہ جوہر لاہوت، وہ عالم اعلیٰ کی چیز ہے جو اس جسم کے ساتھ وہ تعلق نہیں رکھتی جو ایک مظروف کو ظرف کے ساتھ ہوتا ہے۔

آپ کسی گھر کے اندر ہوں آپ کا اس مکان کے ساتھ تعلق جسمانی ہے یعنی اس کے احاطہ میں ہیں اور یہ آپ کو گھیرے ہوئے ہے۔ایک ڈبیا آپ کے قبضہ میں ہوتی ہے، کیا معنی قبضہ میں ہونے کے؟ یعنی آپ کی انگلیوں میں ہے آپ کے ہاتھ کے اندر ہے؟

روح جسم میں اس طرح تو نہیں ہے جیسے ڈبیا میں گھڑی ہوتی ہے یا جیسے مکان میں آدمی ،اسی طرح سے روح ہے جسم کے اندر تو ذرا تشریح کیجئے اعضاء کی۔ڈاکٹری میں اب ذرہ ذرہ الگ کرلیا جاتا ہے،ڈھونڈھئے کہاں ہے روح؟ اس روحِ انسانی کا محل کہاں ہے؟ ڈھونڈ ڈالئے کہیں روح کا پتہ نہیں لگے گا۔کہاں ہے؟ کہیں نہیں ہے،تو کیا واقعی نہیں ہے؟ نہیں ہے تو ضرور، پھر کیا ہر جگہ ہے؟ اس طرح کہ اس کے جز تقسیم ہوں۔

تھوڑی روح ہاتھ میں ہے،تھوڑی پیر میں،تھوڑی سینہ میں،اور اسی طرح؟ اگر ایسا ہے تو ہاتھ کاٹ ڈالئے،اتنی روح جسم سے الگ ہوجائے،پیر کاٹ ڈالئے اتنی روح جدا ہوجائے۔

ایسا تو نہیں ہے سوائے بعض مخصوص اجزا کے جن کے کٹنے کے بعد جسم کی بنیاد باطل ہوجاتی ہے اس لئے روح پورے جسم ہی سے ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔کوئی جزو ایسا نہیں کہ اس کے کٹنے سے روح میں کمی پیدا ہو،پھر کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ماننا پڑے گا کہ ہے ضرور مگر اجزا تقسیم نہیں ہیں،کسی خاص جگہ نہیں ہے کہ وہ جگہ اس کا محل قرار پائے کسی جزو سے خصوصیت نہیں رکھتی۔

بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ہے اور کہیں نہیں ہے" یہ معنی ہیں "لامکاں" ہونے کے جو صفت الٰہی کا ایک ظاہری پرتو ہے۔یہ جوہر قدس جس کے لئے شیخ الرئیس بوعلی سینا نے کہا ہے:۔

هبطت اليك من المحل الارفع ورقآء ذات تعزّز وتمنّع.

اترا ہے تیری طرف عالم بالا سے یہ بلبل یہ قمری،یہ طائر سدرہ نشین اترا عالم بالا سے اور آتے ہی اس نے اس جسم کو نغموں سے معمور کردیا،آتے ہی کایا پلٹ کردی۔لوگ کہتے ہیں کہ ایک سے بہت آثار ظاہر نہیں ہوسکتے مگر نہیں معلوم یہ ایک آنے والا کیسا تھا کہ جس نے دنیائے جسم میں انقلاب پیدا کردیا۔

آنکھیں تھیں ان کے حلقے بھی تھے،کان بھی تھے،ان کے پردے بھی تھے،اعصاب بھی تھے اور ان کی رگیں بھی تھیں مگر کچھ نہیں تھا وہی ایک آنے والا تھا کہ جس نے آتے ہی

آنکھوں کو قوت بصارت دی، کانوں کو قوت سامعہ دی، پیروں میں قوت حرکت دی، سب کو ایک نئی حیثیت میں کر دیا اور پھر ہر جگہ اثر دکھلایا۔ آنکھوں میں آنکھوں کی مناسبت سے اثر، کانوں میں کانوں کی مناسبت سے، ہاتھوں میں ہاتھ کی مناسبت سے۔ کہیں دھوکا نہیں کھایا، آنکھوں کو قوت سامعہ نہیں دے دی، کانوں کو قوت باصرہ نہیں دے دی، جو جس کا حق تھا اسی کو عطا کیا۔ اُدھر سے آنے والے کی یہی شان ہوتی ہے۔ جو اُدھر سے مقرر ہوتا ہے وہ ہر راہ کی حالت سے، ہر ظرف کے لحاظ سے، ہر محل کی مناسبت سے، واقف ہوتا ہے؛۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ۔

جو جسکے مطابق، جو جس کے لائق وہ اسی شان سے عطا کرتا ہے۔ یہ روح مجرد، یہ نفس ناطقہ انسانی، یہ خدائی فرستادہ ہے جو جسم انسانی کے اندر متمکن ہوتا ہے یہ ہے انسان، یہ ہے سب سے اعلیٰ سب سے اشرف، عالم کائنات میں کوئی چیز اس کے مقابل میں نہیں جمادات نہیں، بناتات نہیں، حیوانات نہیں، ملائکہ اس کے مقابل نہیں ملائکہ سے اشرف ہے، سمجھنا تو چاہیے کہ وہ جوہر خاص کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سب سے اشرف ہے، دنیا والوں نے بہت عقل آزمائی کی، حقیقت سمجھنا تو بہت دور تھا، آثار و خواص پر نظر ڈالی، آثار بھی بہت تھے ان میں جو سب سے ممتاز نظر آیا اسے فصل ممیز قرار دیا۔

وہ کیا ہے؟ بہت سے لوگوں نے کہا ''ناطق''، ناطق کے معنی؟ بات کرنے والا، تو کیا گونگا انسان نہیں ہے؟ نہیں بات کرنے والا نہیں بلکہ ''کلیات کا'' ادارک کرنے والا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کیا کسی آدمی نے جانور بن کر دیکھا کہ جانوروں کو ''کلیات'' کا ادراک نہیں ہوتا؟

بہر حال مختلف خیالات، مختلف چیزیں یہ بھی پریشانی طبع کا نتیجہ ہے، یہ تو بچہ بچہ کی زبان پر آ گیا کہ انسان کہتے ہیں مدرک معقولات کو لیکن جو عقل ہی کو نہ سمجھے وہ معقولات کو کیا سمجھے گا، بہر حال عقل حیران رہی کہ کیا ہے؟

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت کا سمجھنا تو ناممکن ہی ہے جو کچھ سمجھنا ہے اثر ظاہر کا سمجھنا۔ تو ہم کو ایسی چیز نکالنا چاہیے کہ جو تمام خصوصیات پر حاوی ہو، انسان کے لئے طرہ امتیاز ہو یعنی جتنی خصوصیتیں ہوں وہ سب اس کے تحت میں آ جائیں، در حقیقت جب ہم غور کرتے ہیں

کہ وہ چیز جو انسان کا جوہر خصوصی ہے جس نے اس کو تمام دنیا کی چیزوں سے ممتاز بنا دیا ہے۔

وہ کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہ علمی اور عملی لامحدود ترقی کی صلاحیت ہے جو خود اختیاری طور پر ہو۔ یہی انسان کا جوہر خاص ہے، علمی وعملی ترقی کی صلاحیت اس میں سب کچھ وہ ہے جو دنیا نے انسان کا مابہ الامتیاز قرار دیا ہے۔ جس چیز کو دنیا نے قرار دیا ہے ''فکر'' و ''نظر'' یعنی ''ادراک کلیات'' معلومات سے مجہولات کا پتہ چلانا۔ یہ ایک شعبہ ہے علمی ترقی کا، یہ درحقیقت صلاحیت ترقی علمی کا ایک کرشمہ ہے، نظر فکر، ترتیب، سب کچھ اسی کے نتائج ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حیوانات کو ''ادراک کلیات'' بھی ہوتا ہے، دلیل یہ پیش کی ہے کہ ایک جانور مثلاً کبوتر یا کوئی اور ایک مرتبہ بلی نے اس پر حملہ کیا اور اس کی کسی طرح جان بچ گئی تو اب وہ ہر بلی سے ڈرنے لگے گا یعنی جب وہ کبھی بلی کو دیکھ لے گا، خوف زدہ ہو گا وہ تو ایک ہی بلی تھی جس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دیکھ کر ایک ہیئت کلیہ اس کے ذہن میں حاصل ہوئی، اب وہ جس بلی کو دیکھتا ہے اس کو ڈر معلوم ہوتا ہے اگرچہ یہ تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے اور دلیل بھی درست نہیں ہے۔

''مثل'' سے ''مثل'' کی طرف انتقال ذہن، یہ بھی ایک خاصہ فطرت ہے۔ کون جا کر بیٹھا اس کے ذہن میں کہ وہ سمجھتا کہ اس ایک کو دیکھ کر صورت کلیہ ذہن میں راسخ ہوتی ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ ایک بلی نے حملہ کیا اب جو اس کی صورت اس کے حافظہ میں آگئی، اب جو اس کے مماثل صورت ہے وہ اس کے ذہن کو اسی پہلے کی طرف منتقل کرتی ہے، اور وہی ایک قائم شدہ خیال حافظہ میں ڈرنے کا باعث ہوتا ہے، لہٰذا اس دلیل سے یہ نہیں ثابت ہو سکتا کہ حیوانات میں ''ادراک کلیات'' ہے اگر ہے تو میں کہتا ہوں کہ کلیات کا عمومی ادراک انسان کا خاصہ نہیں ہے بلکہ نظر وفکر کے ذریعے سے، انتقال تدریجی کے ذریعہ سے وہاں جو انتقال ہے وہ بھی احساسات فطری کے طور پر ہے۔ جو حیوانات کو قدرت سے حاصل ہوتا ہے لیکن خود مختارانہ طور سے مجہول کو حاصل کرنا معلوم سے انسان ہی میں ہے اور کسی میں نہیں تو اب انسان کا جوہر خاص کیا چیز ہوئی؟ تدریجی حیثیت سے علمی وعملی ترقی کرنا، قدرت کا کام صرف صلاحیتیں دے دینا اور قوتیں عطا کر دینا ہے لیکن ان صلاحیتوں کو عالم فعلیت میں لانا ان قوتوں سے حقیقی معنوں میں فائدہ اٹھانا، یہ انسان کا خود اختیاری فعل ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کی انسانیت معرض ظہور میں آتی

ہے۔ معلوم ہوا کہ خود اختیاری حیثیت سے علمی وعملی ترقی کرنا، یہ ایک انسان کا جوہر خاص ہے وہ جسے کہا جاتا ہے کہ انسان کا مابہ الامتیاز ہے یعنی معلوم سے مجہول کا پتہ چلانا حقیقتاً علمی حیثیت سے صلاحیت ترقی کا ایک شعبہ ہے۔

یہ وہی ہے کہ جو جوہر خاص انسان کا ہے یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ایک طرف تو جمادات، نباتات، حیوانات سب سے انسان کو اشرف قرار دیا، دوسری طرف صنف ملائکہ سے بڑھا دیا، صنف ملائکہ پر انسان کو فوقیت حاصل ہوگئی۔ انسان کو کیوں بڑھایا، جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ سے؟ اس لئے کہ ان کی طبیعت میں بلندی اور رفعت ہے ہی نہیں، مادہ ہے۔ پھر مادہ میں بلند پروازی کہاں سے آئے؟ جو کچھ ہے پستی ہی پستی ہے، بلندی کا نام نہیں، ملائکہ وہ بے شک بلند مرتبہ ہستی ہے، رفیع المنزلت وجود ہے۔ بھلا کیا حق مجھ کو کہ میں ملائکہ کی منزل کو پست کہوں۔ عالم بالا کے رہنے والے، سدرہ پر منزل رکھنے والے، جوار حضرت احدیت میں بسنے والے ان کی منزلت کو میں پست کہوں۔ یہ ناممکن ہے، بہت بلند، بہت رفیع المرتبہ، بہت اعلیٰ منزلت۔ مگر میں نے عرض کیا ''خود اختیاری'' ترقی کی صلاحیت کا اختیار کے معنی دو پہلوؤں کے طالب، وجود اور عدم، ہست ونیست، فعل وترک، ملائکہ، بہت بلند ہیں لیکن ان کی بلندی محل، مرتبہ ومنزلت کی رفعت ظاہری اعتبار سے ہمارے لئے ویسی ہی ہے جیسے معمار نے یہ عمارت بنائی، اس کا کنگرہ وہاں رکھا، اینٹیں یہاں رکھیں، ہے ضرور وہ کنگرہ بلند مگر معمار نے وہاں رکھا، ہے بلند، تعریف ضرور کروں گا، سب سے پہلے نظر اسی پر پڑے گی، مگر کیا وہ خود چڑھ کر وہاں گیا۔ اس نے اپنے پیروں سے یہ راستہ بلندی کا طے کیا؟ اس نے اپنی طاقت سے اس منزل ارتقاء کو حاصل کیا؟ نہیں! معمار نے حکمت ومصلحت کی بنا پر اس کی منزل وہاں قرار دی، غلط گو ہوں گا اگر میں اس کو پست کہوں وہ ہے بلند لیکن تعریف ویسی ہی کروں گا جیسی موتی کے آب وتاب کی، ایک صفت ہے جو ہے، بلند ہے منزل، بطور بیان واقعہ کے بلندی کا اعتراف کرلوں کہ ''بڑا کمال'' کیا اتنا بلند ہے کنگرہ، یہ ناممکن ہے اس لئے کہ بنانے والے نے بلند ہی رکھا، اختیاری حیثیت سے بلند ہوتا تب میں تعریف کرتا۔ لیکن جب رکھا ہی گیا بلند تو پھر اس کی تعریف کیسی؟ ویسے ہی انسان کے مقابلہ میں ملک، بلند ہے لیکن پیدا ہی کیا گیا بلند منزل میں، یعنی منزل ظاہر میں بلند، وہاں کی یہ بلندی

رمز ہے انسان سے اس کے پست درجہ ہونے کی، اس کی پاک ومقدس ذات ہے، اس کی ذات میں عصیان کا وجود نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوت عصیان خلق ہی نہیں ہوئی، طاقت گناہ پیدا ہی نہیں کی گئی، صاف وشفاف جس کے دامن کو کوئی دھبہ نہیں۔ بالکل پاک ومنزہ، لیکن انسان کے مقابلہ میں ملک ناز کر سکے؟! ناممکن ہے، تمام ملائکہ بے شک بہت بڑے درجے پر، بہت منزہ اور معصوم، لیکن ان کی عصمت خود اختیاری نہیں ہے، پیدا کیے گئے معصوم، ہیں معصوم، انہیں معصوم نہ کہوں تو ویسا ہی ہے جیسے اس کنگرہ بلند کو پست کہوں، بے شک معصوم لیکن عصمت ان کی مخلوق جیسے وہ خود مخلوق، مگر انسان متحارب قوتوں کا مالک، ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیائے جسم انسانی میں برپا رہتی ہے۔ ایک طرف نفس امارہ کی طاقتیں ہیں وہ اپنی طرف لے جانا چاہتی ہیں، ایک طرف عقل کا لشکر ہے وہ اپنی سی چاہتا ہے کہ کر کے رہے، یہ تصادم ہے، برابر کی طاقتیں ہیں، اس طرف جہل ہے، اس طرف عقل ہے، ان متحارب طاقتوں میں انسان رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کر کے ساتھ دے:۔

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا.

یہ ہے انسان کی قوت امتیاز کا امتحان، یہ ہے انسان کی انسانیت کی کسوٹی، یہاں آکر انسان کی انسانیت ظاہر ہوتی ہے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب قوتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا ساتھ دیا دوسرے سے بیزاری اختیار کی، تو کیا کہنا، پھر تو لڑ بھڑ کر فتح کرنے والا ظفریاب مجاہد ہے۔ راستہ چلتے کوئی مال ودولت ہاتھ نہیں آگیا، بلکہ اپنے قوت بازو سے جنگ کر کے فتح وظفر حاصل کر کے، ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے، یہ انسان ہے یہ ملک کے سامنے آتا ہے، فتح مندی کا نشان سر پر لہراتا ہوا آتا ہے۔ ملک سے کہتا ہے، جو ملک تم کو دیا گیا تھا، بغیر لڑے بھڑے ہوئے، بصرف عطیہ کے طور پر، اس کو میں نے لڑ بھڑ کر فتح کیا، وہ ملک عصمت ہے اور یہ انسان کی طاعت ہے، انسان تمام مختلف قوتوں کا مجموعہ قرار دیا گیا اس مجموعہ میں لا کر ڈال دیا گیا۔

اب جس وقت کہ یہ صحیح وسالم باہر آئے، اس سمندر سے، اس کشمکش سے، حیات سے، اگر یہ کامیاب نکلے تو درحقیقت اس قابل ہے کہ فخر کرے، ناز کرے، یہ جو کچھ حاصل کرتا ہے، اپنے بازوں کی قوت سے، ان کے پاس جو کچھ ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے، اس کو جو کچھ ملا اپنی قوت

اختیار سے۔اس کو جو کچھ ملا، بس اتنا ہی اس سے زیادہ نہیں ہے۔انسان حاصل کرتا ہے اور پھر اپنی قوت عمل سے اس کو بڑھاتا جاتا ہے۔معلوم ہوا کہ انسان کو خود اختیاری ترقی،یہی وہ چیز ہے جس نے ملائکہ کے مقابلہ میں اس کو شرف دے دیا، ملائکہ علم بھی رکھتے ہیں،اور عملی حیثیت سے بھی معصوم ہیں،لیکن علم اتنا ہی ہے جتنا دے دیا گیا ہے،طاعت بھی اسی حد تک جس پر مخلوق ہو گئے۔وہ مختلف ہیں،ان کی شکلیں جدا جدا ہیں،اگر کچھ کھڑے ہیں تو کچھ حالت رکوع میں ہیں، کچھ حالت سجود میں ہیں،مختلف شکلیں مختلف صورتیں،جس حالت میں ان کو قرار دے دیا اس کے خلاف کرنے کے لئے دل ہی نہیں،دل کے ساتھ خواہشیں نہیں۔خواہشات کے ساتھ جذبات نہیں کہہ دیا،کھڑے رہو،کھڑے ہوئے ہیں،کہہ دیا جھک جاؤ،رکوع میں رکے ہوئے ہیں،کہہ دیا سجدے میں چلے جاؤ،سجدے میں ہیں۔

انسان علمی حیثیت سے بھی خود اختیاری ترقی کرنے والا ہے،اور عملی حیثیت سے بھی خود اختیاری ترقی کرنے والا ہے اور یہی وہ چیز تھی کہ جب امتحان کا موقع آ گیا،ملائکہ سے مقابلہ ہو گیا تو انسان نے اسی جوہر سے کامیابی حاصل کر لی،یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر انسان ملائکہ سے بازی لے گیا،مقابلہ ہو گیا تھا،وہ مقابلہ جنگ جویانہ نہ تھا،معاندانہ نہ تھا لیکن تھا مقابلہ،میزان عدل نے اپنی عدالت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک مقابلہ کی صورت قرار دی تھی اور وہ اس وقت جب پیشین گوئی ہوئی تھی:۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔

میں زمین میں اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔

وہ باتیں نہیں عرض کرنا ہے جو اس آیت میں بیان کرنے کے قابل ہیں مجھ کو تو اپنے محل کلام سے جو متعلق ہو (وہی عرض کرنا ہے) ملائکہ نے کہا (مگر قرآن کی وہ آیت یاد رہے)

لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ

بات کرنے میں ارادہ الٰہی پر سبقت نہیں رکھتے۔

دامن عصمت پر دھبہ نہ سمجھا جائے ان کا کوئی قول ارادہ الٰہی کے خلاف نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ کہا کہ:۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۔

کیا خلیفہ وہ مقرر کئے جائیں گے جو زمین میں فساد برپا کریں اور خونریزیاں کریں۔

یعنی نوع انسان کا تاریک پہلو ملائکہ نے پیش کیا، کیونکہ انسان میں دو پہلو ہوتے ہیں ایک مادیت کا ایک روحانیت کا۔ مادیت کا تقاضا بے شک وہی امور ہیں جن میں سے بعض بطور مثال ملائکہ کے قول میں مذکور ہیں، جانشینی کے لئے یہ تجویز ہوا ہے حالانکہ اس میں ایسا عنصر موجود ہے جس کا تقاضا یہ ہے۔ تب ارشاد ہوا:۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

بہت مختصر اور مجمل جواب "میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"

یہ نہ سمجھئے کہ ملائکہ کے سوال کو رد کر دیا گیا، بلکہ قدرت ملائکہ کی تسکین کرنے کے لئے جواب کے لئے تیار ہے اور اسی کے لئے سامان کیا گیا ہے (پہلے میں ان آیات کا ترجمہ جو بہت سے ذہنوں میں ہے وہ پیش کروں گا)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ ۔

آدم کو تمام نام بتلا دئے۔

یہ سامان ہو رہا ہے جواب دینے کا ملائکہ کی بات کے:۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۔

پھر ملائکہ کے سامنے پیش کیا۔

پرچہ امتحان آیا ہے ملائکہ کے ہاتھ میں، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ

اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔

ذرا ان کے نام بتلا دو اگر تم سچ کہتے ہو۔

انہوں نے کہا:۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۔

پاک ہے تیری ذات ہم کو تو نہیں ہے علم مگر اتنا جتنا تو نے ہم کو تعلیم کر دیا۔ علم و حکمت تو بس

تجھ ہی سے مخصوص ہے۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ.

خطاب حضرت احدیت ہوا آدم سے، اے آدم انہیں بتلاؤ تو نام۔

فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ.

جب آدم نے نام بتلا دیے تو!۔

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ، وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ.

ارشاد حضرت احدیت ہوا، میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ملائکہ کی بات کا جواب ہو گیا، لیکن ذرا غور تو کیجئے صورت واقعہ پر کہ ہے کیا؟ دنیا نے جو معنی آیت کے سمجھ رکھے ہیں اس کی بنا پر نتیجہ کیا ہوا؟ ملائکہ نے اعتراض کیا کہ انسان کو ہمارے مقابلہ میں کیا فوقیت ہے، ہم تیری تہلیل کرتے ہیں، تسبیح کرتے ہیں، انسان ہمارے مقابلہ میں کیوں منصب خلافت میں پیش کیا جاتا ہے "اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ" کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے تو پھر بھی پردہ میں رہ جاتا ہے کہ جواب کیا دیا نہیں بلکہ قدرت جواب دینے کے لئے تیار ہے جواب کے لئے سامان کیا کیا گیا؟ کہ آدم کو چپکے سے بتلا دیے "اسماء" تعلیم دے دی گئی۔

اب ملائکہ سے پوچھا جا رہا ہے "ذرا بتانا تو" ملائکہ کو تو بتایا نہیں، آدم کو "اسماء" تعلیم کر دیے "عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ" یہ تو ہے نہیں کہ آدم کو بتایا اور ملائکہ کو بھی ملائکہ کو تو نہیں بتایا، آدم ہی کو بتایا، پوچھا جا رہا ہے، ملائکہ سے "اے میرے ملائکہ تم ذرا یہ نام بتلاؤ" تو اب ملائکہ کیا کہیں گے؟ اس کو جانے دیجئے کہ انہوں نے کیا کہا۔ آپ اپنے مقام پر کیا کہتے ہیں۔ اس سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیجئے کہ خدا کا معاملہ ہے، سمجھئے کہ خدا نہیں کوئی استاد ہے اس نے اپنے ایک شاگرد کو اپنا قلمدان وزارت سپرد کر دیا ہے، دوسرا شاگرد اعتراض کرتا ہے!۔

"یہ نافہم شاگرد ہے، اس کو ہمارے مقابلہ میں امتیاز خصوصی عطا کر دیا، حالانکہ ہم اس سے زیادہ مستحق ہیں"

استاد کو اس اعتراض کا جواب مدنظر ہے، وہ پہلے شاگرد کو چپکے سے گوشہ میں لے جا کر، کچھ خاص رموز بتلا دیتا ہے، اس کے بعد آتا ہے میدان مقابلہ میں، دوسرے شاگردوں سے وہی بے بتائی ہوئی باتیں دریافت کرتا ہے "بتاؤ اگر تم سچے ہو" وہ بے چارے کیا جانیں، ان کو تو بتایا گیا ہی نہیں۔ اب آپ کیا فیصلہ کریں گے؟ کہیں گے کہ استاد نے بے انصافی کی ہے یا نہیں؟ ہر صاحب عقل کہے گا کہ استاد نے بے انصافی کی، اگر امتحان لینا تھا تو لطف تب تھا کہ پہلے شاگرد کو بھی نہ بتایا ہوتا۔ اب چاہے ظاہر میں آپ بات بنالیں مگر درحقیقت عالم انصاف میں دنیائے عدالت میں، کچھ جواب نہیں ہوتا، ان شاگردوں کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم ہے۔

مگر کیا ایسا ہی ہوا؟ اگر آیت کے دنیا نے یہ جو معنی سمجھے ہیں یہی ہیں، تو پھر خدا کا طرز عمل اس استاد سے کچھ الگ نہیں ہے۔ یہ چیز بہت سے دماغوں میں گردش کرتی ہوگی کہ آخر ہے کیا؟ ملائکہ کا آدم سے مقابلہ تھا، یہ بھی خدا کے مخلوق وہ بھی خدا کے مخلوق، انہیں بھی جو کچھ فیض پہنچ رہا ہے یا پہنچے گا وہ بھی اسی کی ذات سے، وہ پرانے شاگرد یہ نئے شاگرد، وہ برسوں کے تعلیم یافتہ یہ ابھی عالم وجود میں آئے اور ابھی عالم ہستی میں قدم رکھا، اب ان سب کے حقوق کو پامال کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس نوکار شاگرد کو، نوآموز مکتب نشین کو چپکے سے بتا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ "بتاؤ تو اس بات کو" اب وہ کیا جواب دیں، اگر انہیں پتہ نہ چلا کہ اس پہلے شاگرد کو بتا دیا ہے تب تو وہ شاید خاموش ہو جائیں لیکن اگر پتہ چل گیا تو پھر جواب میں یہی کہیں گے کہ "حضور! ہمیں بھی بتا دیا گیا ہوتا تو ہم بھی بتا دیتے"۔

اب آیت کا مطلب جو دنیا نے سمجھا ہے، اس کی بناء پر ملائکہ نے یہی جواب دیا:۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا.

ہم تو اتنا ہی بتا سکتے ہیں، جتنا تو نے بتا دیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ امتحان غلط ہو گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ملائکہ جواب دے گئے قدرت کی بات کا، حقیقتاً ان کا جواب لاجواب ہے "قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" انہوں نے کہا، ہم بھی تیرے بتلانے کے محتاج ہیں، تیرے شاگرد ہیں، الگ سے کہاں سے لائیں۔ اب "عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ" کے ساتھ اس جواب کو لگائیے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ انہیں تو تو

نے بتادیا، ہم کو بتایا نہیں تو ہم جواب کیونکر دیتے۔

اس واقعہ کی بنا پر پہلے ہی ممتحن کا طرزِ عمل عادلانہ نہ تھا، اب جس وقت کہ ملائکہ نے سچا جواب دیا، قدرت کو خاموش ہوجانا چاہیے تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ملائکہ امتحان کے بے اصول ہونے کا اظہار کر رہے ہیں مگر قدرت ہے کہ امتحان کی کرسی سے اب بھی نہیں ہٹتی، اب بھی پرچہ نہیں بدلا جاتا، اور زور پڑ رہا ہے "قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ" ملائکہ بے چارے کہہ رہے ہیں کہ ہم کو بتایا نہیں گیا، ہم کیسے بتائیں گے، مگر قدرت ناز کے ساتھ کہتی ہیں "ہاں آدم! ذرا بتا تو دینا" (تو کون سا کمال ہے بتادینا)

اب آدم کو کیا تھا، سکھائے پڑھائے ہوئے تو تھے ہی فرفر سنادیے نام بتادیے، خبر دے دی، اچھا اتنا ہی سہی، غنیمت تھا لیکن قدرت آپ اپنی فتح کا اعلان بھی کرتی ہے۔ حالانکہ انہوں نے شکست تسلیم نہیں کی، اس لئے کہ کہا کہ "اگر دونوں کو یہ بتایا گیا ہوتا تب مزا تھا، مقابلہ کا" اب اگر شکست ہوئی تو یہ شاگرد کے مقابلہ میں شکست نہیں ہوئی، آپ کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ لیکن قدرت گویا ان کی شکست ظاہر کرتی ہے، ان کے مقابلہ میں اعلان کرتی ہے:۔

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۝

دیکھو! میں نہ کہتا تھا کہ میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"

تو کیا ہوا؟ یہ تو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہیں قدرت کی جانب سے (معاذ اللہ!) آخر کیا جواب دے گی دنیا قدرت کی طرف سے کیونکر حمایت کرے گی، حکمت باری کیونکر محفوظ رہے گی، کیونکر عدالت کو صدمہ نہ پہنچے گا، یہ تو ظلم ہے ایک کو بتادیا، ایک کو بتایا نہیں۔ وہ جواب دے رہے ہیں، اس پر بھی فتح کا اعلان ہو رہا ہے یہ تو کسی عاقل کے کرنے کی بات نہیں ہے کہ باوجود اپنی شکست کے ظاہر ہوجانے کے پھر بھی دعویٰ کرے کہ درحقیقت تم کو شکست ہوئی، اس صورت میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آخر تھا کیا، حقیقت امر کیا تھی؟ یہ امتحان کیسا تھا؟ قدرت کی فتح کیونکر ہوئی؟ ملائکہ کی شکست کس طرح ہوئی؟ اس کے لئے ضرورت ہے کہ میں آیت قرآن کا سبق ایک مرتبہ اور پڑھوں۔ اس لئے کہ دنیا نے کتنی مرتبہ نظر ڈالی ان آیات پر، تفسیریں لکھی گئیں۔ مگر دنیا

نے ان ظاہری الفاظ کے ترجمہ کو بھی اب تک نہیں سمجھا، شروع کیجئے آیت کو ابتدا سے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا.

تعلیم کئے آدم کو تمام نام۔

نام کیا تھے؟ لوگوں نے کہا ''تمام مفرد الفاظ'' ہر شئے کے نام، کیا یہی بتایا گیا تھا ملائکہ اور آدم کا مقابلہ اور اس میں فرہنگ لغت کا امتحان! بہر حال نام ''اَلْاَسْمَاءَ كُلَّهَا'' تمام نام تھے۔ اور اسی بات سے تمام دنیا نے دھوکہ کھایا ہے ''کل'' کی لفظ عموم وشمول چاہتی ہے لیکن ذرا سی غلط فہمی ہوئی ''کل'' اتنے ہی دائرہ میں عموم وشمول چاہتا ہے جو اس کے قبل کے الفاظ سے مراد لے لیا گیا ہے۔ اگر ''اَلْاَسْمَاءَ'' میں ''ال'' عموم وشمول کا ہے یعنی ''تمام دنیا کے نام'' تو بے شک آیت اس میں عموم وشمول پیدا کرے گی لیکن اگر ''اسماء'' پر ''ال'' عہد کا ہے یعنی ''اسماء'' سے کچھ خاص اسم مراد ہیں تو ''كُلَّهَا'' اتنے ہی دائرہ میں آکر عموم پیدا کر سکتا ہے۔

''كُلَّهَا'' کے معنی ہیں ''سب کا سب'' اس کے قبل کے لفظ کو دیکھئے ''دنیا کو کہا سب کے سب'' اس میں ایرانی، افغانی، جاپانی، یورپین، سب داخل ہیں، اہل ایشا کو کہا سب کے سب، سب کے سب، کا لفظ نہیں بدلا مگر بتایئے اس میں یورپ والے بھی داخل ہیں، اہل ہندوستان سب کے سب، سب کے سب کا لفظ تو ہی رہا، مگر اب ایشیا کے اور دوسرے مقامات والے لوگ سب نکل گئے، اہل اودھ سب کے سب، دہلی کے سب کے سب، اس میں تغیر نہیں ہے وہ اب بھی محفوظ ہے مگر اب سب کے سب، میں پنجاب والے نہیں داخل ہیں، صرف اودھ میں محدود، اہل دہلی سب کے سب، اہل لکھنؤ سب کے سب، اس میں اب فیض آباد والے داخل نہیں ہوں گے، اہل محلہ ،سب کے سب، حاضرین سب کے سب، اب کوئی بھی جو یہاں حاضر نہیں ہے، داخل نہیں ہو سکتا۔ یہاں ''اَلْاَسْمَاءَ'' سے اگر آپ جمادات، نباتات، حیوانات، سب کے نام مراد لے لیجئے تو بیشک ''كُلَّهَا'' اس میں عموم لائے گا، یعنی استثناء نہ رہے گا لیکن اگر ''الف لام'' آیا ہے ''عہد'' کا اور اس سے اشارہ خاص کی طرف منظور ہے یعنی ''تِلْكَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا'' وہ نام سب کے سب، اب سب کے سب، عموم وشمول کا ذمہ دار نہیں رہے گا، جب تک کہ ''وہ'' کو نہ دیکھ لیجئے تو اب ''وہ'' کون ہیں، میں ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوں وہ حضرات ''سب کے سب'' بے

شک وہ حضرات کو دیکھیے کہ میں نے دس کی طرف اشارہ کیا۔ یا بارہ کی طرف اشارہ کیا"سب کے سب" اسی دائرہ میں آ کر عموم و شمول پیدا کرے گا کہ ان میں سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

بہرحال، ان اسماء میں جنہیں بتلانے کو کہا تھا کوئی نہیں لیکن وہ کون، خاص اسماء ہیں۔ وہ اسماء بتاؤ، بتادیجے، اب آتا ہے وہ لفظ جس کو دنیا نے نہیں دیکھا۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ۔

اسم کی جمع اسماء ہے اور جمع حکم تانیث میں ہوتی ہے۔ شاہد یہیں پر موجود ہے"عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" آدم کو تمام نام بتلائے ۔ یہاں اسماء کی طرف ضمیر پھیری گئی ہے "كُلَّهَا" مونث کی "كُلَّهُمْ" نہیں کہا گیا اور نہ صحیح ہے۔

اس کے بعد ہونا یہ چاہئے تھا"ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ" انہی ناموں کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا"ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ" مگر قدرت نے الفاظ بدل دیئے۔ اب اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ"پھر پیش کیا ان لوگوں کو ملائکہ کے سامنے""ہم" ذوی العقول سے متعلق ہے جس کے معنی ہیں" وہ لوگ" آدم کو تمام نام تعلیم کیے پھر پیش کیا، ان لوگوں کو۔ دنیا کی تفسیروں میں سب لکھا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدعیان علم یہاں کیونکر غافل ہو گئے، تفسیروں میں لکھا ہے"اسماء" پیش کیے گئے۔ مگر ہے"پیش کیا ان لوگوں کو" یہ کیا؟ یعنی" نام" کیا لوگ ہوتے ہیں؟ پھر وہ نام تو، جناب والا! آپ کے بقول، حیوان بھی اس میں ہیں، دیواریں بھی اس میں ہیں، در بھی اس میں، کیڑے مکوڑے بھی اس میں ہیں، ذوی العقول، سبھی مگر ان کے نام تو "ذوی العقول" نہ ہوئے تو اسماء تعلیم کیے۔ پھر ان لوگوں کو پیش کیا ملائکہ پر یہ عجیب لفظ ہے۔ اس کے علاوہ "نام پیش کیے"، "فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ" ۔ مجھ کو بتلاؤ یہ نام جو پیش کیے گئے۔ یہ عجیب لفظ ہے، پیش بھی کر دیئے گئے نام اور پھر کہا جا رہا ہے کہ بتلاؤ نام، یعنی آپ کسی لڑکے سے پوچھیے کہ"ب" کے بعد"ت" کون سا حرف ہے۔ وہ کہہ دے گا کہ آپ نے تو خود ہی بتلا دیا کہ"ت"۔ نام پیش کر بھی دیئے گئے اور پھر پوچھا بھی جا رہا ہے کہ ہاں نام تو بتاؤ۔ کیا کہنا اس حکمت کا۔ بہرحال اس صورت میں"ابناءھم بھذہ الاسماء" ہونا چاہیے یہ" نام بتلاؤ" مگر وہاں یہ ہے"انبأوا باسماء ھولاء" ان لوگوں کو پیش کیا ملائکہ کے سامنے اور یہ کہا

کہ ان لوگوں کے نام بتلاؤ۔

معلوم ہوا کہ وہ معنی جو دنیا والوں نے قرار دیئے ہیں لفظی اور معنوی لغوی حیثیت سے آیات قرآن سے بالکل بیگانہ ہیں۔

اب اصل حقیقت معنی پر غور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ مذکورہ بالا آیات پر شروع سے پھر غائر نظر ڈالی جائے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا.

آدم کو وہ نام سب تعلیم کئے گئے۔

نام کن کے تھے، بعد کی لفظیں بتلاتی ہیں کہ کچھ ذی روح صاحبان ہوش وخرد یعنی انسانی جماعت سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کے نام تھے۔اس کے بیان کرنے کی مجھے اس وقت ضرورت نہیں کہ وہ ہستیاں کون تھیں، یقیناً اگر تھیں تو وہی جو سر سبد عالم ایجاد ہستیاں سمجھی جا سکتی ہیں۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

ملائکہ کے سامنے وہی نام نہیں پیش کئے گئے تا کہ یہ کہا جائے کہ جو آدم کو بتلا دیا گیا تھا، وہی اب ملائکہ سے پوچھا جا رہا ہے، بلکہ وہ ہستیاں پیش کی گئیں جن کے نام تھے، نام ملائکہ کو کیسے معلوم ،آدم کو بھی نام صرف بتلائے گئے مگر امتحان قوت فراست کا ہی مسمیات دکھائے جا رہے ہیں، نام جن کے ہیں وہ سامنے لائے جا رہے ہیں ان کے ناموں کو دیکھ کر اسماء کی تطبیق کرو یعنی یہ بتاؤ کہ کون نام کس کے ہیں" اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ " ان لوگوں کے نام (معین کر کے) بتلاؤ۔

یہ چیز بتلائے ہوئے حدود سے خارج تھی، ملائکہ کا علم تھا محدود جتنا قدرت کی طرف سے علم حاصل ہوا۔بس اتنا ہی ان کے پاس موجود لیکن معلومات سے مجہولات کا علم حاصل کرنا بات سے بات پیدا کرنا، علمی ترقی خود اختیاری حیثیت سے کرنا یہ انسانیت کا خاصہ تھا۔

ملائکہ نے اپنے قصور طبیعت کا اعتراف کیا کہا!۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ.

بار الہا! ہم تو اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا کہ تو نے ہم کو تعلیم دیا ہے، ہمارے بس کی یہ بات نہیں کہ ہم اس سے زیادہ کچھ بتا سکیں۔

اب قدرت انسان کی طرف متوجہ ہوئی، ہاں انسان! یہ تیرے جوہر کے نمایاں ہونے کا وقت ہے تونے بھی اگر اتنا ہی بتایا تو ملائکہ میں اور تجھ میں امتیاز ہی کیا ہوا۔

اب تو بتادے کہ ان ناموں میں سے ان صورتوں کے کون سے نام ہیں۔ وہی سوال آدمؑ کے سامنے بھی پیش ہوا جو ملائکہ سے کیا گیا تھا "اَنۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ" ہاں آدمؑ! تو تم بتاؤ، یہ انسان تھا جو بتائی ہوئی بات سے زیادہ بتا سکتا تھا۔ اس نے اپنی قوت تمیز سے کام لیا، اس نے اپنے شعور خاص سے کام لیا۔ اس نے ناموں کو دیکھا، مسمیات پر غور کیا، مناسبتیں دیکھیں، دونوں کے درمیان، اس کے بعد یہ بتادیا کہ یہ اس کا نام ہے یہ اس کا نام ہے۔ اس طرح انسان کا امتیاز ملائکہ کے مقابلہ میں ثابت ہوا۔ انسان کو جتنا بتایا گیا ہو اس سے زیادہ خود پیدا کرے۔

یہ نقطہ اول تھا انسانیت کا، یہ ابجد تھی درجہ انسانیت کی، اس کے بعد انسانیت نے کہاں تک ترقی کی، نقطہ اول وہ تھا جو ملائکہ سے آگے بڑھ گیا، اتنی سی بات پر کہ بے بتائے ہوئی بتادی، وہ ابتدا تھی عالم انسانیت کی، اس کے بعد انسانیت نے کہاں تک ترقی کی؟ یہ سمجھ لیجئے، قامت آدمؑ کے الف پر ایک کم ایک لاکھ چوبیس ہزار صفر اور آئے اور انسانیت اتنے درجے بلند ہوئی، اس وقت خاتم النبیینؐ مبعوث ہوئے، اس وقت رسول آخر الزمانؐ دنیا میں آئے، اب جو جوہر انسانیت آدمؑ میں تھا وہ کیا گم ہو جاتا؟ اگر وہ معیار فضیلت انسانیت تھا تو آدمؑ نے ایک بتائی ہوئی بات سے ایک بات خود پیدا کی تو اب اس رسول آخر الزمان کا جو وصی ہوگا۔ وہ یہ کہتا ہوا آئے گا کہ:۔

عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلْفَ بَابٍ مِنَ الْعِلْمِ فَتَحَ لِیْ کُلُّ بَابٍ اَلْفَ بَابٍ.

مجھ کو رسول اللہؐ نے ہزار باب تعلیم کئے،

تو وہ جس نے ملائکہ کے مقابلہ میں اپنی فضیلت ایک بات سے ہزار ہزار باتیں پیدا کر کے ثابت کردی یقیناً ملائکہ کے مخدوم ہونے کا مستحق ہے اور دنیا اس کے مقابلہ سے قاصر ہے۔

واضح رہے کہ میرا موضوع بحث مستقل طور سے اس آیت کا بیان کرنا نہیں ہے اگر میرا موضوع بحث یہ آیت ہوئی کہ:۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً.

اس وقت میرے فرائض آئینی میں سے یہ ہوتا کہ میں اس آیت سے جتنے شعبے متعلق

ہیں اور جتنے اجزاء قابل توضیح ہیں ان سب کو بیان کروں، اگر کوئی جز چھوٹ جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے اپنے موضوع کو ناقص چھوڑ دیا لیکن یہ منزل وہ نہیں ہے۔ سلسلہ تفسیر قرآن جو یک شنبہ کو پابندی کے ساتھ بیان ہوتا رہا ہے، اب دوسرے پارہ تک پہنچا ہے اور یہ آیتیں پہلے پارہ کے قریب نصف کی ہیں، وہاں یہ بیان ہو چکی ہیں تقریباً پانچ یک شنبوں تک اسی ایک آیت کی تفسیر بیان کی گئی تھی۔ اور اس کا یہ جز جو نہایت اختصار سے صرف موضوع کلام کی خاصیت اور محل کلام میں استشہاد کے طور پر آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ وہاں (یعنی یک شنبوں کے موعظوں کے سلسلہ میں، رپورٹر) بیان کیا جا چکا ہے وہاں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ خلیفہ کے کیا معنی ہیں، ملائکہ نے جو اعتراض کیا وہ ان کے شان عصمت کے خلاف تو نہیں ہے۔ خدا نے جو جواب دیا وہ سوال کا اقرار تھا، یا انکار؟ ملائکہ کا دعویٰ بمقابلہ آدم کہاں تک قابل تسلیم تھا؟ اس کے بعد یہ جز تھا کہ تعلیم اسماء جو کی گئی تو اسماء سے کیا مراد تھی۔

اور اس کے اوپر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آدمؑ کو اسماء بتلا دیئے گئے اور ملائکہ سے بے بتائے ہوئے پوچھے جا رہے ہیں حق انصاف جب ادا ہوتا جب آدمؑ کو بھی نہ بتایا گیا ہوتا۔ یہ صورت منافی عدل معلوم ہوتی ہے اور ایک ممتحن کی شان کے خلاف ہے۔ اس کا جواب آپ کے سامنے مختصر طور سے عرض کیا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ آدم کو بتایا گیا تھا وہ اگر ملائکہ سے پوچھا گیا ہوتا تو امتحان غلط ہو جاتا، امتحان کا معیار قائم نہ رہتا۔ جیسا کہ عام مفسرین کی تفسیروں سے ثابت ہوتا ہے یعنی آدمؑ کو اسماء تعلیم کئے پھر وہی اسماء ملائکہ سے دریافت کئے، آدمؑ کو بتا دیا گیا تھا ملائکہ کو نہیں بتایا گیا تھا، ملائکہ بے چارے بتاتے کیونکر انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو تیرے بتانے کے پابند ہیں، اس طرح سے امتحان امتحان نہیں ہو سکتا سازش ہو جاتی ہے یعنی گویا قدرت اور آدمؑ میں سازش ہو گئی تھی۔

نہ واقعی کوئی فوقیت آدمؑ کی ملائکہ پر ثابت ہوتی ہے لیکن صورت حال جو قرآن مجید پیش کر رہا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ آدم کو اسماء تعلیم کئے گئے تھے اور ملائکہ سے صرف وہ اسماء نہیں پوچھے جا رہے ہیں یعنی جو چیز آدم کو بتائی تھی اسی کا سوال نہیں ہے، بلکہ اس بتائی ہوئی چیز کے علاوہ

کچھ اور سوال، بتائے تو تھے نام، مگر پوچھے جا رہے ہیں وہ جن کے یہ نام ہیں۔ انہیں پیش کر کے دکھایا جا رہا ہے ان اسماء کو ان کے مطابق کر کے بتاؤ کہ یہ کون ہیں، تو وہ بات جو آدمؑ کو بتائی گئی تھی وہ پوچھی نہیں گئی تاکہ کہا جائے کہ آدمؑ نے بتا دیا، تو کیا کہا کیا اس لئے کہ سکھایا جا چکا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ملائکہ کو بھی نام بتائے گئے یا نہیں، ملائکہ کو نام پہلے سے معلوم تھے، حجاب قدس پر لکھے ہوئے تھے، قائمہ عرش پر لکھے ہوئے تھے، ابواب جنان پر لکھے ہوئے تھے، یہ نہیں ہوا کہ جن کے نام تھے ان کے مطابق بھی کر کے دکھا دیئے جاتے کہ یہ نام ان کے ہیں۔ یہ سوال کرنا کہ خود قرآن مجید میں یہ کہاں لکھا ہے کہ ملائکہ کو اسماء تعلیم کئے گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں یہ بھی تو نہیں لکھا ہے کہ ملائکہ کو نہیں بتائے گئے تھے۔ یہ امر کہ خدا عادل ہے اور خلاف عدل وانصاف نہیں کرتا براہین عقلیہ ونقلیہ سے مستقل طور پر ثابت ہے۔ جو کچھ بھی ہم کو اندیشہ کرنا چاہیے وہ اس سے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی نہ مل جائے جو عدل کے خلاف ہو لیکن اگر ہر بات جو اصلیت واقعیت رکھتی ہے وہ قرآن مجید میں ہم کو لکھی ہوئی بھی مل جائے، ایسا نہیں ہے دنیا کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں، اب اگر ان کو خدا کی طرف نسبت دے کر ہم سے پوچھے کہ یہ بات جو خلاف عدل ہے، خدا نے کی یا نہیں؟ میں کہوں گا کہ نہیں کی مگر جو چیز قرآن میں موجود ہو اور وہ خلاف عدل ہو تو وہ چیز ہمارے خلاف حجت ہو سکتی ہے۔

قرآن صرف اتنا کہہ رہا ہے کہ آدمؑ کو صرف اسماء بتائے، قرآن یہ کہتا کہ اسماء کے ساتھ آدمؑ کو مسمیات بھی بتائے تو قرآن پر الزام آجاتا، اور اگر یہ کہتا کہ ملائکہ کو اسماء کبھی نہیں بتائے گئے تھے، تب بھی الزام عائد ہوتا۔ قرآن نے یہ نہیں کہا، بلکہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آدمؑ کو جو بتلایا گیا تھا وہ ملائکہ سے نہیں پوچھا گیا لیکن اب وہ اسماء بتائے گئے تھے ملائکہ کو یا نہیں اس قرآن میں نہ نفی ہے نہ اثبات ہے۔ جب نہ تو نفی ہے اور نہ اثبات ہے تو وہ شخص جو عدالت الٰہیہ کا قائل ہے اس کا پابند کیوں ہونے لگا جس سے عدالت الٰہیہ پر الزام آئے۔

اصل شبہ جس کے جواب کے لئے ہم کو اتنا پریشانی تھی وہ یہ تھا کہ ہمارے قرآن میں ایسی کوئی بات نہ نکل آئے جو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہو۔ یہاں کون کہتا ہے کہ یہ آیت اثبات

عدل کے لئے آئی ہے۔ عدل کی دلیل کیا ہے؟ وہ قرآن کی دوسری آیتوں سے ثابت ہو؟ حدیث سے ثابت ہو؟ عقل سے ثابت ہو؟ جہاں سے بھی ثابت ہو لیکن یہ میں نے کب کہا کہ اس آیت سے بھی ثابت ہے تاکہ مجھ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ جزو جس پر عدالت مبنی قرار پاتی ہے اس آیت میں دکھلایئے۔ مجھے تو یہ دکھلانا تھا کہ اس آیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو عدل کے خلاف ہو اور یہ مشکل اس تفسیر کی بنا پر باقی رہتی ہے جو عام طور سے اس آیت کے لئے سمجھی گئی ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا عادل ہے، حکیم ہے۔ عادل وحکیم نہ سہی مگر ایک معمولی درجہ کے عاقل سے تو کم نہیں ہوسکتا، اس میں تو کسی شخص کو اختلاف نہیں۔

خدا کی جانب سے کوئی ایسی بات عالم وقوع میں نہیں آسکتی جو کم از کم کوئی عاقل نہیں کرسکتا۔ مگر ان تفاسیر کی بنا پر قرآن جو واقعہ پیش کررہا تھا، وہ ایسا ہی ہے کہ ایک ادنیٰ عاقل کی طرف بھی وہ منسوب نہیں ہوسکتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا جو ہمارے سامنے پیش تھا، میں نے ثابت کردیا کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے، قرآن جو کچھ کررہا ہے وہ اس سے الگ ہے۔ آپ اگر علیحدہ سے کوئی چیز شریک کیجئے جو مخالف عدل ہو، یا موافق عدل تو یہ اپنے ہاتھ کی بات ہوگی۔

قرآن جو واقعہ پیش کررہا ہے وہ صرف اتنا کہ اسماء بتائے گئے تھے اور یہ جزو علیحدہ رہا کہ ملائکہ کو بھی اسماء معلوم تھے یا نہیں؟

میں کہتا ہوں کہ ملائکہ کو اسماء پہلے ہی سے معلوم تھے یہ کیونکر؟ اپنی احادیث کی بنا پر، جو خدا کی طرف عدل لازمی قرار دینے کو ننگ وعار سمجھتا ہو میں اسے پابند نہیں بنانا چاہتا۔ میں اپنے فرقہ کے معتبر روایات اور احادیث کی بنا پر جو خدا کی طرف کسی نقص کو ناگوار سمجھتا ہے یہی کہتا ہوں کہ ملائکہ کو اسماء پہلے ہی سے معلوم تھے، یہ اسماء انہی اشخاص کے تھے جو اشخاص پیش کئے گئے۔ جہاں جہاں یہ اسماء تھے وہاں یہ نہیں تھا کون کس کا نام، اشخاص پر تطبیق اسماء نہ تھی، اسماء سب کو معلوم تھے، آدمؑ نے تو عالم وجود میں تازہ قدم رکھا ہے بے خبر ہیں، درحقیقت آدم کو بتلانا معیار عدل کو درست کرنا تھا، یعنی آدمؑ کے ساتھ ناانصافی ہوتی اگر نہ بتایا جاتا۔ قدرت نے ملائکہ اور آدمؑ کے معیار کو برابر کیا، ملائکہ کو جو چیز پہلے سے معلوم تھی اور آدمؑ کو نہ معلوم تھی وہ آدمؑ کی بتادی گئی۔

تاکہ آدمؑ کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، جو فیض استاد کی طرف سے پہنچنے والا تھا، دونوں شاگرد

برابر ہو گئے تو اب ذاتی قوت فراست کا امتحان شروع ہوا کہ اسماء کی تطبیق کریں مسمیات پر، یہ سوال پیش ہوا ملائکہ نے شکست کا اعتراف کیا، ابھی تک میں یہی کہہ رہا تھا کہ قرآن نے اس جزو کو تذکرہ ہی نہیں کیا کہ ملائکہ کو اسماء بتائے گئے تھے۔

لیکن حقیقتاً ایک مخفی اشارہ قرآن کے اندر موجود ہے کہ اسماء بتائے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو یہاں دو چیزیں ہیں ایک اسماء اور ایک تطبیق اسماء مسمیات پر، اسماء دونوں کو بتائے گئے تھے، تطبیق اسماء کسی کو نہیں بتائی گئی تھی۔ قرآن میں جو ملائکہ کا جواب درج ہے اس کے دو انداز ہو سکتے تھے۔ ایک انداز تو یہ ہو سکتا تھا کہ ہم نہیں جانتے یا یہ ہو سکتا ہے کہ کہتے ہیں ہم نہیں بتا سکتے۔ اس کو جو ہم کو نہیں بتایا گیا، مگر یہاں ترکیب اثبات ونفی کی لائی گئی ہے یعنی ملائکہ نے کہا "ہم نہیں جانتے مگر اتنا جتنا ہمیں بتایا گیا ہے" معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی دو جزو تھے، ایک جز بتایا گیا تھا اور ایک جز نہیں بتایا گیا تھا اور امتحان اسی جزء کے متعلق تھا جو نہیں بتایا گیا۔ تو ملائکہ نے یہی کہا کہ اگر اتنا ہی پوچھا جاتا ہے جتنا بتایا گیا تھا، تو ہم اتنا بتا بھی سکتے ہیں۔ یہ جزو وہ تھا کہ جو مشترک تھا آدمؑ اور ملائکہ کے درمیان میں "سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" بالکل وہی ترکیب ہے کہ

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" "نہیں ہے خدا مگر اللہ" "اِلَّا" سے اثبات اور "لَا" سے نفی۔ وہی ترکیب بعینہ یہاں ہے کہ "ہم کو کچھ علم نہیں مگر وہ جو ہمیں بتا دیا گیا ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ نے بھی اپنے جاننے کا اقرار کیا ہے، تعلیم دونوں کو ہوگئی، اس میں دونوں مشترک ہو گئے لیکن اصل سوال یہ تھا کہ جتنا بتایا گیا ہے اس سے زائد بتاؤ، ملائکہ نے اس پر اپنی شکست کا اعتراف کیا۔ اب نظر قدرت متوجہ ہوئی، آدمؑ کی طرف، تم اے آدم! بتاؤ:۔

فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔

جب آدم نے خبر دی ناموں کی تو اب قدرت کو فتح حاصل ہوئی، خدا نے ثابت کر دیا کہ امتحان میں آدمؑ ملائکہ سے زیادہ ثابت ہوئے۔ ارشاد ہوا:۔

"میں نے نہ کہا تھا کہ میں جو تم نہیں جانتے ہو اس کو جانتا ہوں"۔

اس طرح سے ملائکہ کو آدمؑ کے مقابلہ میں شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ آدم کی فضیلت ثابت

ہوئی، تھا یہ کہ معلوم سے مجہول کا پتہ چلانا، یہی وہ چیز تھی جس نے آدم کو ملائکہ پر شرف دے دیا، یہی وہ چیز ہے جو جوہر کمال ہے انسان کا۔ انسان کی صفت خاص ہے، علمی حیثیت سے ترقی، اب ایک لفظ میں نے یہ کہا تھا کہ "لامحدود درجہ تک" یعنی ہر چیز کی ترقی محدود ہے۔ حد طبعی کے اندر۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ خدا نے ہر شئے کے اندر ایسی صلاحیتیں قرار دی ہیں کہ وہ ترقی کرے، مگر ہر چیز کے حدود طبعی کے اندر قدرت نے منازل ترقی قرار دیئے ہیں۔ اس کی توضیح کے لئے مثال دی تھی جو منزلہ مکان کی۔ اگر انسان کی ترقی بھی محدود ہو تو پھر کوئی فرق نہیں رہ جاتا انسان اور غیر انسان میں سوائے اس کے کہ ہر چیز ترقی کرتی ہے مگر وہ ترقی خود اختیاری ترقی نہیں ہوتی۔ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں میں "تکوینی" ترقی ہوتی ہے اور انسان کی ترقی اس کے قوت بازو سے ہوتی ہے۔ اپنے ارادہ و اختیار سے ہوتی ہے، ایک تو یہ فرق ہے انسان اور غیر انسان میں۔

لیکن اس کے علاوہ بھی یہ فرق ہے کہ ان کی ترقیاں محدود ہیں، اس لئے کہ عالم امکان میں سب سے نیچے جمادات ہیں جن کے آگے نباتات موجود ہیں۔ جماد کی نوع ذاتی، قدم آگے بڑھائیں تو جماد کا در ختم ہو جائے گا، نباتات کی نوع آ جائے گی لہٰذا ترقی محدود ہوئی، اسی طرح نباتات ترقی کریں گے تو محدود ترقی کریں گے کیونکہ ان کے آگے حیوانات کا پہرا بیٹھا ہوا ہے اور حیوانات ترقی کریں گے تو کہاں تک؟ ان کے آگے انسان پرا جمائے ہوئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر چیز کی ترقی محدود ہے لیکن انسان وہ ہے جو لامحدود ترقی کرنے والا ہے، انسان نقطۂ آخر ہے عالم امکان کا، کوئی درجہ انسان سے بالاتر نہیں ہے اس لئے انسان کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کی ترقی کا درجہ کہیں پر جا کر رک نہیں جاتا، انسان کے بلند ہونے میں کوئی روک نہیں ہے اس لئے کہ عالم امکان کی آخری سرحد ہے اور خود عالم امکان لامحدود ہے۔ یہ عجیب چیز معلوم ہوگی اس لئے کہ امکان خود محدود ہے لیکن پھر میں کہتا ہوں کہ وہ محدود ہونے کے ساتھ لامحدود ہے، عالم امکان کی کوئی حد نہیں ہے اور یہ انسان آخری سرحد ہے عالم امکان کی، اس لئے اس کا دائرہ لامحدود حیثیت سے ہونا واضح ہے، میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ عالم امکان کے آگے کیا ہے؟ عالم وجوب ہے، وجوب کی صفت کو آپ محدود قرار دے سکتے ہیں؟

اگر وجوب کی صفت محدود ہو جائے تو "امکان" ہو جائے۔ اس لئے کہ معیار "وجوب" لامحدود ہوتا ہے اور امکان کا سرا "وجوب سے" ملا ہوا ہے یعنی امکان کے آگے بلندی کے حصہ میں بس وجوب ہی ہے۔ خیال کیا آپ نے؟ اور "وجوب" لامحدود ہے۔ جب کہ امکان کا آخری سرا وجوب سے ملا ہوا ہے یعنی امکان کے حدود کا ختم ہو جانا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس پر اگر ایک نمبر اور بڑھا دیا جائے تو وہی وجوب کا درجہ ہے لہٰذا وجوب بھی محدود ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ ادھر امکان محدود ہوا ادھر وجوب بھی محدود ہوا۔ اب دوسری لفظوں میں عرض کروں محدود پر جو اضافہ ہوگا تو وہ بھی محدود ہوگا، یعنی آپ ۱۰ کروڑ فرض کر لیجئے، لیکن پھر بھی قابل اضافہ ہے اور وہ جو اس پر اضافہ ہوا وہ بھی محدود ہی ہے۔ تو اگر امکان کا آخری سرا کوئی ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ وجوب کا پہلا سرا ہے تو پھر جس چیز کا سرا مل جائے وہ محدود ہے یا لامحدود۔

دوسری بات یہ ہے کہ "ممکن" کو جو ملتا ہے وہ واجب سے یا کہیں اور سے ممکن محدود ہو گیا۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ واجب کا فیض محدود ہو گیا اور یہ ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ مختلف درجہ کے الفاظ میں مطلب ادا ہو، مگر اختلاف افہام کے مطابق ہو، ایک فقیر ہے اس کو جو کچھ ملتا ہے ایک غنی کی سرکار سے ملتا ہے فرض کیجئے کہ اس غنی کا خزانہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے تو کیا میں نہ کہوں گا کہ اس فقیر کا سہارا کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

اب میں نے جو کہا تھا کہ امکان محدود ہے لیکن محدود ہونے کے ساتھ لامحدود اس کے کیا معنی؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنا بھی عالم وقوع میں آئے اور ممکن جتنے درجوں کو بھی طے کر لے وہ ہمیشہ محدود ہی ہوں گے لیکن پھر بھی لامحدود ہے یعنی اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے کسی درجہ پر ٹھہرتا نہیں ہے جیسے "اعداد" لامحدود ہیں پھر بھی محدود ہیں۔

اس معنی سے کہ جتنے عدد ہوں گے وہ محدود ہوں گے اگر محدود نہ ہوتے تو محدود کیونکر ہوتے یعنی شمار میں کیونکر آتے؟

لیکن آپ اپنے نزدیک بڑے سے بڑا عدد لیجئے، ایک دن بھر ہزار ہزار کہے جایئے، اور شام کو مہاسنکھ کہہ دیجئے، تو میں کہوں گا کہ اس پر ایک اور اضافہ کر دیجئے، لہٰذا لامحدود ہوا یعنی ہمیشہ قابل اضافہ ہے یونہی امکان کے مدارج ترقی ہیں جتنا عالم وجود میں آئے گا وہ محدود ہی

ہوگا اگر لامحدود ہو تو "واجب الوجود" ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ ہمیشہ محدود ہی ہے لیکن پھر بھی لامحدود ہے یعنی ہمیشہ قابل اضافہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جتنے ممکنات عالم وجود میں آتے ہیں حکمت وقدرت الٰہی کی بنا پر اس لئے مصلحت نظام عالم، انتظام دنیا کسی ایک معیار پر پہنچ کر وجود امکانی کا دروازہ بند کردے یعنی اس سے بڑھ کر کوئی وجود عالم وجود میں نہ آئے لیکن خدا کی قدرت ختم ہوگئی؟ یا امکانی ترقی کی حد امکانی حیثیت سے ختم ہوگئی؟

یہ غلط ہے، اس لئے کہ وہ ہستی جو درحقیقت عالم امکانی کی فرد منتخب تھی، عالم امکانی میں جس سے بڑھ کر کوئی فرد عالم وجود میں نہیں آئی وہ مرتے مرتے مرگئی لیکن آخر وقت تک زبان پر "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" جاری رہا۔ عالم وجود میں جناب رسالت مآبؐ سے بڑھ کر کوئی ہستی نہیں ہے کہ جس نے قدم رکھا ہو۔ دنیائے وجود اس ہستی پر آکر ختم ہوگئی۔ عالم امکان کی آخری سرحد جناب رسالت مآبؐ ہیں۔ وہ آخری لفظ تھے مدارج کمال انسانیت کا جس کے بعد انسانیت نے قدم آگے نہیں بڑھایا جس کے بعد پھر ظرف زماں میں وسعت نہ تھی، یہ آخری ہستی تھی مگر یہ آخری ہستی بھی آخری وقت تک یہی کہتی رہی، خداوندا میرے علم میں اضافہ کر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خزانہ ختم نہیں ہوتا، اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم کے فیض وکرم میں پھر بھی گنجائش تھی، اس لئے برابر سوال کرتے تھے اور برابر مانگتے تھے اور اُدھر سے فیوض کی بارش میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، درجے بلند ہوتے رہتے تھے جو چیز محدود ہو اس میں اضافہ کہاں ممکن؟

مگر ہمیشہ طالب رہے، ہمیشہ مانگتے رہے، اور ہمیشہ درجے بلند ہوتے رہے، نہ سمجھو کہ اب بھی درجے ختم ہوگئے، بلندی موقوف ہوگئی یہ انسان کے کام پر موقوف ہے انسان کے لئے ایسے ذرائع بھی ہیں کہ اگر ان پر عمل کرے تو وہ ترقی کرتا رہے اور اس کے درجے بلند ہوتے رہیں "مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ." "جو شخص کوئی اچھی بات قائم کردے تو جتنے چلنے والے ہوں گے اس تحریک پر اس کا ثواب اس کے لئے ہوگا قیامت تک۔

آپ کیوں نہ ایسے کام کیجئے کہ دنیا سے چلے جایئے تب بھی زندہ رہیئے، یہ زندگی ختم ہوجائے تب بھی حیات ابدی حاصل رہے۔ جنہوں نے زندگی کے مفاد کو سمجھا تھا، جنہوں نے

واقعی زندگی بسر کی تھی، انہوں نے ایسے کام کئے کہ مرنے کے بعد بھی واقعی وہ مرے نہیں، زندہ رہے کیونکہ اصل موت انسان کی ترقیوں کا ختم ہونا ہے۔ وہ جو دنیا میں مفید کام کر جاتے ہیں تو خود چلے جاتے ہیں تب بھی ان کی ترقی کے درجے ختم نہیں ہوتے، ایک معمولی سی مفید بات ایک اچھی سنت کوئی قائم کر دے تو اس کا ثواب اس کے نامہ عمل میں برابر لکھا جاتا ہے۔ تو جس نے بنائے، سنن جاری کی ہو، جس نے مذہب کی تبلیغ کی ہو، جس نے اسلام کو قائم کیا ہو، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس کی ترقیاں دنیاوی زندگی کے ختم ہونے پر ختم ہو گئیں؟ ہر وقت ان کے مدارج ترقی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے خود انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کی بنا پر ان کی سیرت پر عمل کرنے سے (جتنے افراد عمل کریں سب انہی کے فیض کا نتیجہ ہے) خدا کے فیض ان کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ اور پھر ان کے احسانات کا یہ نتیجہ تھا اور ان کی عملی زندگی کا یہ ثمرہ تھا کہ قدرت نے دوسروں کو مامور کیا کہ تم ایسے ذرائع اختیار کرو جس کی وجہ سے ان کی ترقی اور بھی ہوتی رہے یہ درحقیقت کیا تھا کہ ہر مسلمان پر فرض عائد کیا کہ جب رسول کا ذکر آئے تو صلوٰۃ بھیجو "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" تمہارے ذکر کو ہم نے بلند کیا۔ ذکر کا بلند کیا جانا یہی ہے۔

یہ انسان کی زندگی ہے لامحدود، علمی و عملی حیثیت سے ترقی کرنا لامحدود درجہ تک، یہی وہ ہے جو انسانی زندگی کا مفاد ہے۔ اب انسان کی زندگی کیا ہوئی؟ اس کی ترقی کے دروازوں کا کھلا رہنا، انسان کی موت کیا ہوئی، ان ترقیوں کے دروازوں کا مسدود ہو جانا، آپ اگر دیکھیں گے کہ دنیا میں کون سا آئین زندگی ایسا ہے جو انسان کی زندگی کے لئے مفید سمجھا جا سکتا ہے۔

جس قانون نے اور جس مذہب نے انسان کی علمی و عملی ترقی کے لئے راہیں صاف کی ہوں، جس نے انسان کو علمی اور عملی ترقیوں کے راستے بتائے ہوں، وہی انسان کی زندگی کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے اور جس مذہب نے انسان کی علمی و عملی ترقیوں پر پہرے بٹھائے ہوں، سد راہ قائم کئے ہوں، اس کو آپ سمجھ لیجئے کہ وہ مذہب آئین اور قانون ناکارہ ہے۔ اس معیار پر اب اسلام کو لائیے دوسرے تمام دنیا کے مذاہب کے مقابلہ میں۔ اور دیکھئے کہ اسلام نے کہاں تک علمی و عملی ترقیوں کے سبق دیئے ہیں راستے صاف کئے ہیں اور دوسروں نے کس طرح انسان کو جکڑا ہے، ترقیوں کو روکا ہے، اس معیار پر آپ کو ماننا پڑے گا کہ اسلام صحیح مذہب ہے۔

مذاہب عالم اور انسانی ترقی

ہم جس وقت دنیا کے مذاہب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے مذاہب نے علمی و عملی ترقی کے راستے بجائے صاف کرنے کے ان پر پہرے بٹھا دیئے ہیں اور روکا ہے۔ اس کے بیان کے لئے میرے بیان کے دو شعبے ہو جاتے ہیں۔ ایک علمی حیثیت سے انسان کی ترقی اور ایک عملی حیثیت سے انسان کی ترقی۔ اب تک دونوں مخلوط تھے مگر اب یہاں سے الگ کئے دیتا ہوں اور پہلے علمی ترقی بیان کروں گا اس کے بعد عملی۔

انسان کی علمی ترقی اور مختلف مذاہب کے تعلیمات

علمی ترقی کے لئے قدرت نے انسان میں وہ جوہر ودیعت کیا جس نے درحقیقت انسان کو اشرف قرار دیا۔ وہ جوہر تھا معلومات سے مجہولات کا پتہ لگانا۔ لیکن دنیا کے مختلف مذاہب نے کیا کیا؟ یہ کیا کہ عقلوں پر پہرے بٹھائے، آنکھوں پر پردے ڈالے، غور کرنے کو گناہ قرار دیا۔ ان کی تعلیم یہ رہی کہ آنکھ بند کرو اور مان لو، آنکھ کھولنا جرم بتایا، آنکھ کھولی تو کفر والحاد کا الزام لگایا، مذہب کی تعلیم یہ رکھی کہ اعتقادات دوسری چیز ہیں اور عقل دوسری چیز ہے، یعنی اعتقاد میں عقل کو دخل نہ دو۔ اگر آپ کسی عیسائی کے سامنے جا کر مسئلہ تثلیث کو دریافت کریں کہ ایک ہی چیز بوقت واحد تین بھی ہے، اور تین ہوتے ہوئے ایک بھی ہے تو وہ کہے گا یہ راز ہے عقل انسان سے بالاتر۔ اس کی بنیاد بس ایمان پر ہے، عقل سے کام نہ لو۔ اگر آپ فدیہ کے رمز کو پوچھئے کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے کے گناہ کا بار اپنے اوپر لے لے، ایک کے سولی پر چڑھ جانے جانے کے بعد، ہمیشہ کے لئے دوسروں کو مطلق العنان کر دیا جائے۔ وہ کہے گا کہ اس پر ایمان لانا چاہئے یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل سے کام لینا جرم قرار دیا گیا۔ مگر جس وقت ہم اسلام کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام ہمیشہ صاحبان عقل کو مخاطب کرتا ہے۔ اسلام اپنی فتح ہی میں سمجھتا ہے کہ لوگ عقل وغور سے کام لیں۔

میں وہ آیات اور روایات جو اس سے تعلق رکھتے ہیں بیان کروں گا کہ کس کس طرح

اسلام نے عقل کو دعوت دی ہے، علمی ذرائع مہیا کئے ہیں، لیکن ابھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی مذہب اور اہل مذہب کی ذہنیت اس کے روایات مذہبی سے ثابت ہوتی ہے۔

میں آپ کے سامنے توریت کی عبارت پڑھتا ہوں۔اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح انسان کے لئے عقل سے کام لینے کو روکا گیا ہے۔اس کے بعد اسلام کی تعلیم مختصر لفظوں میں پیش کروں گا، یہ توریت ہے اسکو یہود اپنی خاص مقدس کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ توریت پر بحیثیت مسلمان ہونے کے میرا ایمان نہیں ہے مگر اس کتاب پر یقیناً میرا ایمان نہیں ہے یہ عہد قدیم کے نام سے موسوم ہے جس کے لاکھوں کروڑوں نسخے ہر سال دنیا میں شائع ہوتے ہیں، جو ہزاروں زبانوں میں ترجمہ ہو چکی، جس پر سلطنتوں کی طاقتیں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ ہماری بے حسی ہے کہ ہم اپنے قرآن کو جو خزانہ ہے معلومات کا پردہ میں چھپائے ہوئے ہیں اور دنیا اس کتاب کو جس سے وہ سادہ لوح افراد کو گوسفندان عیسیٰ کی جماعت میں داخل کرتی ہے اس طرح دنیا میں پھیل رہی ہے وہ ان کا احساس ہے اور یہ ہماری بے حسی۔

حضرت آدمؑ اور ان کا قصہ

ملاحظہ ہو توریت سفر پیدائش ب ۲:۔

"خداوند نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوش نما اور کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا، اور خداوند خدا نے آدمؑ کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے اور خداوند خدا نے آدمؑ کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔

ب ۳:

اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اس نے عورت سے کہا، کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا؟ عورت نے سانپ

سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کے مانند نیک و بد کی جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا، اس نے کہا تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا تب خدا وند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا"۔

یہ ہے توریت اس سے سبق یہی حاصل ہوتا ہے کہ نیک و بد کی پہچان بری چیز ہے، عقل کا صرف کرنا معصیت ہے، یہی چیز وہ تھی جس نے آدمؑ کو جنت سے نکالا۔

اس کے برخلاف اسلام نے کیا تعلیم پیش کی؟ جو میں پیش کر چکا ہوں کہ جب انسان کا ملک سے مقابلہ پڑا تو یہی صفت علم ایسی تھی جس نے ملائک پر فتحیاب کر دیا۔ جنت سے نکلنے کے واقعہ کو قرآن نے بھی بیان کیا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے ہماری روایات میں یہ ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز منع کی گئی درحقیقت وہ چیز ہے جو انسانیت کی روحانیت

سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ مادیت سے تعلق رکھتی ہے اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ مادی خواہشوں میں زیادہ منہمک نہ ہو۔ رہ گیا علم، علم وہ چیز ہے کہ ملائکہ پر جس سے شرف حاصل ہوسکا۔

علمی ترقی اور اسلام کے تعلیمات

یہ تعلیم کہ انسان کو علم حاصل کرنا اور عقل سے کام لینا حرام ہے۔ بالکل فطرت کے خلاف ہے حضرت احدیت نے انسان کو جوہر عقل عطا کیا اور اس جوہر عقل کے ذریعہ سے انسان کے لئے علمی ترقی کے راستوں کو کھولا۔

اگر انسان کا آنکھیں بند کئے رہنا قدرت کے نزدیک مناسب ہوتا تو اس کو آنکھیں دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

قدرت نے تو جو چیز دی ہے وہ کام لینے کے لئے دی ہے اگر اس پر پابندی عائد کی جائے ایسی کہ وہ معطل ہوجائے تو وہ شئے بیکار اور عبث ہوجاتی ہے۔ آپ کو آنکھیں عطا کی گئیں ہیں اگر آنکھوں کے بند رکھنے کا حکم دیا جائے کہ وہ آنکھیں کور ہوجائیں تو پھر آنکھیں دینے کا کیا نتیجہ تھا۔ قوت سامعہ عطا کی، لیکن اگر حکم ہوتا کہ اس کو بند کئے رہو تو کچھ دن میں وہ قوت فنا ہوجاتی۔ اس لئے کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائے وہ قوت انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، وہ لوگ کہ جو کسی وجہ سے کچھ دن تک صاحب فراش رہے ہوں تمام دن جگہ سے اٹھتے نہ ہوں اور پابند بستر ہوجائیں تو اگر ان میں جسمانی قوت آبھی جائے تب بھی کچھ دن تک ساتھ نہیں دیتی، ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ قوت کے ایک عرصہ تک معطل رہنے سے طاقت عمل کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایک تاریک تہہ خانہ اس میں آپ ایک طویل مدت تک رہئے کوئی چیز نہ دکھائی دے، سوائے تاریکی کے نظر کچھ کام نہ دے اس کے بعد آپ آیئے روشنی میں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ روشنی آپ کے لئے اندھیرے سے بڑھ کر ہے، اتنے وقت تک نظر کے معطل رہنے نے بیکاری سے الفت پیدا کردی۔ اب اگر آپ روشنی میں آتے ہیں یعنی اگر میدان عمل ملتا بھی ہے تو نظر کام کرنے سے انکار کرتی ہے۔ آپ کسی دن معمولی سے زیادہ سو رہیئے، اتفاق سے نماز صبح کے وقت تک آنکھ نہ کھلے جب آپ آنکھیں کھولئے گا تو آپ کو دیر تک آنکھیں ملنے کی ضرورت ہوگی۔ شب میں

آنکھیں معطل رہیں کام نہیں کیا، اب کھلی بھی ہیں تو کام نہیں کرتیں، یہ عارضی التو کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے عارضی بیکاری پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر اتنی مدت گذر جائے کہ قوت بالکل مصروف عمل ہی نہ ہو اور کام کرنا اسے یاد ہی نہ رہے تو یقیناً وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی اور کسی صورت سے کام کرنے کے قابل نہ بن سکے گی۔

قوت عاقلہ حضرت احدیت نے غور کرنے کے لئے دی ہے اگر اسے سوچنے سمجھنے کا حق دینا نہ ہوتا تو وہ سوچنے کی طاقت انسان میں پیدا ہی نہیں کرتا۔

اس نے جبکہ تمام افرادِ حیوانی کے اندر انسان کو اس صفت خاص کا مالک بنایا تو اس کا کمال نوعی یہی قرار پانا چاہیئے کہ وہ اس قوت سے بیش از بیش کام لے اور اس کو معطل و بے کار نہ بنائے۔

دوسرے مذاہب عقل کی کارگذاری اور قوت عاقلہ کے صرف و استعمال سے گھبرائیں اس لئے کہ وہ خطرہ کا احساس رکھتے ہیں۔

ان کا عقلی قوتوں پر پہرے بٹھانا خود بتلاتا ہے کہ وہ عقل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اس لئے اس حریف کی قوت توڑنا اپنا فرض جانتے ہیں۔

ایسے مذاہب ماننے کے قابل کہاں تک ہیں جو عقل ہی کے ساتھ دشمنی رکھتے ہوں۔ یہ ارباب عقل کے سمجھنے کی چیز ہے بشرطیکہ غور کرنے کا موقع ملے۔ اسلام دنیا میں اسباب کا دعویدار ہو کر آیا کہ وہ عقل و فطرت کا مذہب ہے۔

اس نے عقل کو خاموش نہیں کیا بلکہ اور بیدار بنایا، وہ پکارتا ہے تو صاحبان عقل کو، انصاف کا طالب ہے تو اہل عقل سے۔

مجنون و دیوانہ اور بالکل فاتر العقل کو تو اس نے اپنی تکالیف ہی سے مستثنیٰ کر دیا اور مرفوع القلم بنا دیا۔

وہ زمانہ جب زیادہ تر قوائے عقلی ناقص ہوتے ہیں یعنی بچپنے کا دور اس کو اس نے اپنی پابندیوں سے علیحدہ رکھا۔

بلوغ کا وقت جو قوائے عقلی کے بھی تکمیل ہونے کا زمانہ ہے اس وقت سے اس نے اپنا پہلا پیغام پہنچایا اور تکالیف متوجہ کئے۔

وہ قرآنی تعلیمات کو رہنما بتلاتا ہے مگر کس کا؟ صاحبان عقل کا!:۔

إِنَّ فِي هَٰذِهِ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ.

اس میں آنکھیں کھولنے اور یاد آوری پیدا کرنے کا سرمایہ ہے صاحبان عقل کے لئے۔

کہیں ارشاد ہوتا ہے:۔

لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ.

یہ قرآن نازل کیا گیا اس لئے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور وتدبر سے کام لیں اور صاحبان عقل کی یاد آوری ہو۔

کہیں ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّ فِي هَٰذِهِ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔

اس میں عبرت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے صاحبان عقل کے لئے۔

کہیں:۔

لَعَلَّهُمْ يَعْقِلُونَ. لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ۔

وغیرہ الفاظ سے تعقل وتذکر کے مقصد کو آرزو اور تمنا کی صورت میں پیش کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسے حسرت ہے، اسے آرزو ہے، تمنا ہے کہ لوگ عقل سے کام لیں، غور وفکر کی طاقت کو صرف کریں اور سوچ کر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے اصول کی کامیابی اسی میں ہے، وہ اپنی فتح اسی میں مضمر سمجھتا ہے، کہیں وہ آواز دے کر پکارتا ہے اور ارشاد کرتا ہے "يَا أُولِي الْأَلْبَابِ" اے عقل رکھنے والو! معلوم ہوتا ہے کہ صرف عقل کو صدا دے رہا ہے، یہی تو اس کی بات مانے گی اور اس کے کہنے کی تصدیق کرے گی۔ وہ مذمت کرتا ہے ان لوگوں کی جو آنکھوں سے کام نہیں لیتے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا.

یہ لوگ آخر قرآن میں غور وفکر سے کام کیوں نہیں لیتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟

ادھر توریت کی وہ تعلیم کہ نیک و بد کی تمیز حاصل کی، عقل و شعور سے کام لیا اور بس مر گئے۔ ادھر قرآن کی یہ تہدید کہ ''آخر تم غور و فکر کرتے کیوں نہیں؟'' اس کے بعد جو لوگ غور و فکر اور عقل و شعور سے کام نہیں لیتے ان کے لئے ارشاد فرمایا ہے:۔

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ.

در حقیقت یہ لوگ صورتاً انسان ہیں مگر چوپایوں سے بدتر ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا.

ان کے دل تو ہیں سینوں میں مگر قوت عاقلہ سے کام نہیں لیتے، ان کے کان تو ہیں مگر قوت سامعہ سے کام نہیں لیتے، ان کے آنکھیں تو ہیں مگر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

یہ تمام چیزیں عطا کی گئیں ہیں کام لینے کے لئے، لیکن انسان نے اوہام کے پردوں سے عقل کو چھپا دیا، انسان نے تعصب، تنگ نظری اور تقلیدی کورانہ کے ذریعہ سے عقل کے کمالات کو مردہ کر دیا۔ عقل انسانی کو معیار کمال پر پہنچانے کے لئے عقل انسانی کو اس کے صحیح درجہ ترقی پر لانے کے لئے، اس نے یہ ارشاد کیا کہ:۔

إِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ.

در حقیقت وہ نابینا ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے کیونکہ ظاہری آنکھوں کا کور ہونا حقیقتاً کور ہونا نہیں ہے بلکہ کور ہونا جو ہے وہ دل کی آنکھوں کا کور ہونا ہے۔

وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے، اس کا صحیح صرف نہیں کرتے ان کے متعلق ارشاد ہے کہ وہ لوگ روز قیامت نابینا محشور ہوں گے:۔

وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ.

میں ایسے شخص کو روز قیامت اندھا محشور کروں گا۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا.

انسان یہ کہے گا کہ کیوں مجھ کو نابینا محشور کیا گیا حالانکہ دنیا میں میں آنکھیں رکھتا تھا۔

تو ارشاد ہوگا:۔

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى

ظاہری آنکھیں تمہاری تھیں تو مگر جب تم ہماری قدرت کی نشانیاں دیکھتے تھے تو ان کو بھلاوے میں ڈال دیتے تھے، آج تم بھلاوے میں ڈالنے کے لائق ہو۔

وہ لوگ جو اپنی گذشتہ رسموں کے پابند ہو گئے تھے اور اپنے آباو اجداد کی سنت پر اس طرح سے عامل تھے کہ ان کے پاس کوئی دلیل اس کے سوا نہ تھی کہ ہم نے اپنے آباو اجداد کو جس راستے پر دیکھا ہے اسی راستے پر جا رہے ہیں، ان کو قرآن نے سخت الفاظ میں تہدید کی:۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔

وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس مسلک پر دیکھا ہم بھی اسی پر چلے جائیں گے۔

ایک جگہ:۔

نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔

ہم بس اسی کا اتباع کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے۔

قدرت نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے:۔

قُلْ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔

تم اپنے باپ دادا کے راستے پر چلے جاؤ گے چاہے تمہارے باپ دادا خود صحیح راستے پر نہ رہے ہوں اور چاہے انہوں نے کچھ عقل سے کام بھی نہ لیا ہو۔

درحقیقت انسان کی انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ وہ عقل و غور سے کام لے اور صحیح راستے کی شناخت کرے۔ یہ نہیں کہ ہمارے باپ دادا اس راستے پر تھے، اس لئے ہم بھی ہیں۔ باپ دادا کا اتباع و پیروی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے ذاتی کانوں سے، آنکھوں سے اور عقل سے راستہ معین کرے۔ اس طرح سے اسلام نے علمی ترقی کے راستوں کو کھولا، انسان کی علمی ترقی کی رہنمائی کی، اور وہ کہ جنہوں نے انسان پر پابندی عائد کی تھی اور کہتے تھے کہ عقل سے کام نہ لو، جو کہتے تھے ایمان اور چیز ہے اور عقل اور چیز ہے، عقل کو دخل دینا گناہ ہے۔ اگر توحید فی التثلیث ہے تو اس پر ایمان لاؤ، جاننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر فدیہ مسیح ہے تو ایمان لاؤ

جاننے کی کوشش نہ کرو۔ وہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے عقل کو مسدود کرنا چاہا تھا، جنہوں نے عقل کو کور بنانا چاہا تھا، اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کسی کا قول مذہب کے بارے میں قابل تسلیم نہیں ہے یعنی اصول عقائد اس لئے ماننے کے قابل نہیں ہیں کہ فلاں شخص نے انہیں کہا ہے بلکہ اصول عقائد تمام تر عقل پر مبنی ہیں۔ انسان اپنی عقل سے غور کرے اور صحیح راستے کو معین کرے جنہوں نے کہا کہ عقل انسان کو فنا کے درجہ تک پہنچادے گی انہوں نے انسان کو عقل سے کام لینے سے روک دیا۔ جب نسلیں گذر گئیں تو عقل بھی معطل ہو گئی، اور عقل کی قوتیں بھی زائل ہو گئیں۔ اب عقل غور وفکر کرنے پر تیار بھی نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے ابتدا ہی سے چھوٹی چھوٹی مثالیں دے کر عقل انسانی کو سمجھایا ہے۔ قرآن شریف کو کیا ضرورت تھی کہ ادلہ و براہین پیش کرے، اس کے لئے کافی تھا یہ کہہ دینا ”مان لو کہ خدا ہے“ اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی مگر اس نے اصول مذہب کو بتایا تو دلائل کے ساتھ، ہر قسم کے معیار طبع کے موافق کہیں پر مخفی، کہیں پر ظاہر، کہیں پر سطحی، مختلف افکار، مختلف عقول کے معیار کے مطابق دلائل پیش کئے تاکہ ہر شخص اپنی عقل سے غور کرے۔

اس نے یہ ارشاد کیا:۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

یہ نہیں کہا کہ ”تم مان لو“ یہ نہیں کہا کہ ”تم تسلیم کرلو“ اور بس! بلکہ ان سے کہا ”تم غور کرو کہ آسمان اور زمین میں کیا کیا حکمتیں اور نشانیاں مضمر ہیں“۔

ارشاد ہوا:۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

آسمان وزمین کی خلقت میں، شب وروز کی آمد ورفت میں، ان کشتیوں میں جو سطح آب پر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چلتی رہتی ہیں اور وہ کہ جسے خدا آسمان سے نازل کرتا رہتا ہے، اب باراں اس کے ذریعہ سے زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مرنے کے بعد، اور ان میں

جو اس نے زمین میں پھیلا دیئے ہیں حیوانات، اور ہوا کے انقلابات میں اور اس ابر میں جو خدا کے اختیار میں ہے نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل سے کام لے۔

درحقیقت اس نے دعوت دی، اپنی عقل سے کام لینے کی کہ دیکھو! اپنی عقل سے کام لو، اور سمجھو کہ یہ حقائق قابل تسلیم ہیں یا نہیں، یہ معارف و معلومات اس قابل ہیں کہ تم ان کو تسلیم کرو، یا نہیں اس نے اپنے رسولؐ اپنی کتاب بلکہ خود اپنے وجود جس چیز کے اعتقاد کی بھی دعوت دی درحقیقت غور و خوض کے بعد یہی توحید کا مسئلہ تھا اس کو اتنا روشن بنایا۔ ارشاد ہوا: ''ادھر جانے کی ضرورت نہیں جدھر نظر اٹھا کر دیکھو ہماری نشانیاں ہی نظر آئیں گی''۔ جو چیز انسان کی نظر کے سامنے آئے اس میں خدا کی نشانیاں اس کو دکھلائی دیں گی۔ فرض کیجئے کہ کسی کی نظر کبھی آسمان پر نہیں پڑی، زمین پر نظر نہیں پڑی، کبھی نباتات کو نہیں دیکھا، کبھی دریا کی روانی نہیں دیکھی مگر خود تو اپنے پاس ہے، خود تو کبھی اپنے سے جدا نہیں ہوا، کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں اپنے نفس پر نگاہ کرلے اگر غور کرے۔ ہمارے وجود سے اپنی ہستی کو معمور پائے گا، لیکن غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے، یہاں ایک غلط فہمی ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ اکثر افکار و عقول میں تشویش پیدا کرے، وہ یہ ہے کہ آخر دنیا والے جنہوں نے خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کیا کیا وہ عقل کے مالک نہ تھے؟ کیا وہ عقل نہیں رکھتے تھے؟ جنہوں نے ہوائی جہاز بنادیئے، ریلیں بنادیں، طرح طرح کے آلات ایجاد کئے، یہ لوگ کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ میں عرض کروں گا کہ ابھی میں کہہ چکا کہ ہر چیز میں کام لینے سے طاقت پیدا ہوتی ہے اور بغیر کام لئے ہوئے اس میں طاقت نہیں پیدا ہوتی اور جس چیز سے آپ کام لیں گے اسی خاص شعبہ میں اسے طاقت حاصل ہوگی جس میں کام لیا گیا ہے۔ میں نے اکثر یہ مثال دی ہے کہ انگلیاں یہ ایک مختصر سا جز جسم انسانی کا ہیں ظاہر میں یا کمزور ہوں گی یا طاقت ور، مگر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ بوقت واحد کمزور بھی ہوں اور طاقت ور بھی ہوں، یہ میری انگلیاں ہیں اگر ان میں آپ کسی دن سوئی دے دیں، سوئی میں بھی انہی انگلیوں کا کام ہے اور انہی کی طاقت کی ضرورت ہے لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ چند ہی منٹ سینے کے بعد انگلیوں میں درد پیدا ہوجائے گا۔ اب میں آپ سے پوچھوں کہ میری انگلیاں طاقت ور ہیں یا کمزور۔ معلوم ہوگا کہ کمزور ہیں لیکن کسی دن قلم دے دیجئے، میری انگلیوں

میں صبح سے شام تک میرے سامنے کاغذ رہے اور میں لکھتا رہوں اس میں بھی سینہ، بازو اور پیروں کی طاقت کی ضرورت نہیں ہے یہ کام بھی انگلیوں ہی کا ہے، یہاں اب انگلیاں کمزور ثابت ہوئیں یا طاقت ور، انگلیاں تو طاقت ور ثابت ہوئیں۔ یہ کیا ہے کہ وہی انگلیاں بوقت واحد طاقت ور بھی ثابت ہوئیں اور کمزور بھی، بے شک طاقت ور بھی ہیں اور کمزور بھی یعنی اس شعبہ میں جس میں کام کیا ہے طاقت ور ہیں مگر اس شعبہ میں جس میں کبھی کام نہیں کیا کمزور ہیں، بس یوں ہی سمجھ لیجئے عقل کے بھی دو شعبے ہیں ایک مادیت کا ایک روحانیت کا۔ عقل نے مادیت میں کام کیا بڑی ترقی کرتی چلی گئی، روحانیت میں کام نہیں کیا اس لئے اس شعبہ میں ایک طفل نومولود کے برابر ہے۔ درحقیقت طاقت ہر چیز کی اس شعبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے جس میں اس نے کام کیا ہے دھوکا نہ کھایئے کہ اگر کوئی پہلوان اتنا طاقتور ہے کہ بڑے سے بڑے پہلوان کو مغلوب کرلے، تو وہ منبر پر آکر تقریر بھی کرلے گا، وہ صرف اپنے ہی شعبہ میں طاقت ور ہے دوسرے شعبہ میں طاقت جسمانی بھی کمزور ثابت ہوگی۔

بہر حال عقل سے غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ عقل سے غور کرو، حقیقت کو سمجھو یہ غلط ہے کہ اسلام علم کے حاصل کرنے کے خلاف ہے، یہ غلط ہے کہ علمی ترقی سے اسلام کو کوئی صدمہ پہنچے گا اور اسلام کا کوئی نقصان ہوگا اگر علم علم ہے اور درحقیقت انکشاف حقائق کا نام ہے تو جتنا علم دنیا میں ترقی کرتا جائے گا دنیا پر حقائق اسلام منکشف ہوتے جائیں گے، اسلام نے تو اپنی بنیاد قائم کی ہے علم کی ترقی پر۔

درحقیقت اسلام کو کفار کے ایمان کے راستے پر لانے میں جو کچھ بھی شکست ہوئی وہ ان کی علمی کمزوری کی وجہ سے اور جتنی فتح ہوئی وہ علم کو کام میں لانے سے، وہ جاہل عرب جو اپنے آباواجداد کے طریقہ کے تابع تھے جو غور وفکر سے کام لینا نہیں جانتے تھے جو بات کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے ان کے مقابلہ میں اسلام کو کامیابی نہیں ہوئی اس لئے کہ اسلام علم کا حربہ لے کر آیا تھا، اسلام درحقیقت تامل وتدبر کی سلاح سے جنگ کرنے آیا تھا، لہٰذا جن لوگوں نے علم سے کام نہیں لیا وہ یہی کہتے رہے کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو جس راستے پر دیکھا ہے اس پر چلے جائیں گے اسلام کی کسی بات کو نہ انہوں نے سنا نہ عمل کیا لیکن جن لوگوں نے آنکھیں کھولنے

کی کوشش کی سمجھنے کی کوشش کی بس ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں اور حقیقت اسلام جلوہ گر ہوگئی۔ بس ایک شعاع نور حقیقی کی تھی جو دل پر پڑی اور وہ اسلام لانے کے لئے کافی تھی، اسلام نے اپنی بنیاد قائم کی ہے علم کی ترقی پر لہٰذا اسلام علمی ترقی سے لرزہ براندام کیوں ہونے لگا، اسلام کے لئے تو یہ شگون نیک ہے کہ دنیا میں علمی ترقی ہو، جتنی علمی ترقی ہوگی، تعصب گھٹے گا تقلید کا جذبہ جاتا رہے گا، آبا واجداد کے مذہب سے نفرت ہوگی دنیا مسلمان ہوگی، چاہے زبان سے اپنے تئیں عیسائی کہے یا مادہ پرست کہے، وریہ کہے، مگر عقائد کے اعتبار سے اسلام کے سامنے سرتسلیم خم کرے گی یہ ہماری کمزوری ہوگی اگر ہم علمی ترقی کو اسلام کے حقائق کے ساتھ ساتھ نہ ثابت کرسکیں، در حقیقت اسلام علم کی ترقی سے نہیں ڈرتا، اور اسلام کی یہی حقیقی جذابیت اور کشش ہے کہ وہ خود علم کی بنیادوں پر مبنی ہے اس وقت مسلمان سو رہے ہیں وہ تعلیم وتبلیغ کی طرف متوجہ نہیں ہیں لیکن اسلام خود ہی دوسروں کو اپنے دائرہ میں لا رہا ہے، اسلام خود ہی اپنا مبلغ ہے، خود اپنا ظاہر کرنے والا ہے خود اپنے محاسن سے دنیا کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ در حقیقت جتنا علم ترقی کرے گا دنیا پر حقائق اسلام منکشف ہوتے جائیں گے جو چیز براہ راست فرائض میں داخل ہے وہ بے شک انہی چیزوں کا علم ہے جو عقیدہ و احکام مذہبی سے متعلق ہوں لیکن یاد رکھئے کہ دنیا میں جتنے علمی معارف ہیں وہ اگر صحیح طور سے ترقی کریں تو پیش خیمہ قرار پاتے ہیں اسی ایک مقصد کا جو روح مذہب اسلام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس الگ چیز ہے جغرافیہ الگ چیز ہے یہ سب چیزیں مذہب سے جداگانہ ہیں لیکن ان علوم سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو در حقیقت یہ تمام چیزیں مختلف راستوں میں لے جا کر پھر ایک نقطہ حقیقت پر جمع کردیتی ہیں میں آپ سے پوچھوں کہ اسلام نے توحید کو کس طرح سے منکشف کیا، اسلام نے خدا کے وجود کو آثار قدرت کے ذریعہ سے واضح کیا، خدا کے وجود کو سمجھایا مخلوق کے ذریعہ سے ان مخلوقات کے محاسن دکھلائے، ان کے رموز واسرار پیش کئے گئے، ان میں جو حکمتیں مضمر ہیں ان کے ذریعہ سے بتلایا کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے، آثار قدرت کے ذریعہ سے عقل کو معرفت حاصل کرائی جس طرح ایک تصنیف کے ذریعہ سے مصنف کی جلالت قدر ظاہر ہوتی ہے اسی طرح آثار قدرت کے ذریعہ سے خدا کے علم وقدرت کو ثابت کیا۔ اب بتلائیے کہ اگر کوئی ایک تصنیف ہمارے سامنے پیش ہوئی ہمارا علم محدود

ہے، اس کے ظاہری پہلو جو تھے صرف اتنا ہی ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن اس تصنیف میں جو باریکیاں ہیں ان کو ہم نہیں سمجھ سکتے، یقیناً ہم اس تصنیف کی صرف ایک حد تک قدر شناس ضرور قرار پائیں گے، لیکن جیسی جلالت مصنف کی اس تصنیف کے ذریعے سے ثابت ہو سکتی ہے وہ ہم نہیں سمجھ سکتے مگر کوئی شخص ایسا ہو جو اس تصنیف کو ایسا پڑھے اور غور کرے کہ اس کی اندرونی باریکیوں کا اس کے تمام مطالب اور واقعی ترکیب ساخت، حسن انتظام، مطالب جزئی کے مناسبات کا اندازہ کرلے تو مصنف کی جلالت قدر اس کی نظر میں زیادہ ہوگی یا نہیں یونہی سمجھ لیا جائے کہ قرآن جس وقت نازل ہوا، صحرائے عرب کے رہنے والے موجودات عالم کے باریک پہلوؤں سے بالکل بے خبر صرف ظاہری آثار کو دیکھنے والے تھے لیکن قدرت نے اتنے ہی علم سے اور اتنے ہی معارف سے جو ظاہری آثار کے متعلق تھے اپنے معرفت کے لئے فائدہ اٹھایا اور ان آثار کے ذریعہ سے اپنے کمال حکمت سے دنیا کو روشناس کرایا، اگر علمی دنیا ترقی کرتے اور اشیاء کے رموز واسرار زیادہ منکشف ہوتے جائیں، ان کے اجزاء ان کی باریکیاں ں کھلتی جائیں تو یہ در حقیقت ان کے خالق کی حکمت کو زیادہ نمایاں کرنے کا باعث ہوں گی، یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ ہم دنیا کے سامنے یہ پیش کرتے تھے کہ دیکھو خدا کی حکمت کو ایک مختصر سے مختصر حیوان یعنی یہ جو ہوا میں اڑتا پھرتا ہے اور راتوں کو انسان کو اذیت دیتا ہے یہ ایک معمولی مختصری ہستی رکھنے والا حیوان (مچھر) اپنے اس مختصر سے جسم میں وہ تمام اعضاء وجوارح رکھتا ہے جو ہاتھی باوجود اپنی عظمت جسمانی کے اپنے میں رکھتا ہے، بلکہ اس میں پر پرواز قدرت نے عطا نہیں کئے اس میں پر پرواز بھی ہیں۔ تو کیا کہنا اس مصنف کے اقتدار کا جو کبھی اتنے وسیع صفحہ پر انہی نقوش کو بنانے پر قدرت رکھتا ہے اور کبھی اتنی مختصری جگہ پر اس تمام دنیا کو سمیٹ دینے پر قادر ہے یہ مثالیں ہم پیش کرتے تھے اور خدا کی حکمت وقدرت کو اس طرح سے سمجھاتے تھے دنیا کو، قدرت نے اس مسئلہ کو چھوڑا نہیں بلکہ اس نے کہا:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۔

خدا کو اسباب میں شرم نہیں آتی کہ وہ اگر مثال کے لئے ضرورت ہو تو مچھر کو مثال میں

پیش کرتا یا مچھر سے بھی زیادہ چھوٹی چیز جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں رموز و حقائق جلوہ گر ہیں۔

بے شک اس مختصر ذی روح کو دیکھنے سے اس کے خالق کی معرفت حاصل ہوتی ہے لیکن اگر دنیا کی تحقیقات ایک ایسے نقطہ تک پہنچ جائے کہ وہ مچھر سے بھی زیادہ مختصر، باریک سے باریک تر مخلوق کا پتہ چلالے جو ذی حیات بھی ہو لیکن آنکھوں سے دکھلائی نہ دیتا ہو، پانی کے ایک ایک قطرہ میں جس کی سینکڑوں فردیں موجود ہوں وہ کونسا قلم تھا جس نے اس مختصر ہستی میں وہ سب کچھ ودیعت کردیا جو ایک جاندار اور ذی حیات کے لئے ضروری ہے۔ تو بتایئے کہ خدا کی حکمت اور زیادہ منکشف ہوئی یا پردہ خفا میں چلی گئی؟ ایک وقت تھا کہ انسان خود اپنے اندرونی جسم کے آثار کو نہیں جانتا تھا کہ ہمارے کون سے اجزا کس مقصد کے لئے ہیں۔ مگر اب ایک زمانہ وہ آیا ہے کہ انسانی اجزاء کے تمام خواص و فوائد ظاہر ہو گئے۔

یہ تمام باتیں جو منکشف ہوئیں تو ان سے کیا پتہ چلا، یہ پتا چلا کہ جتنے علوم ہیں وہ جتنی ترقی کرتے جائیں اس بنانے والے کی حکمت کی اور بھی زیادہ وضاحت کریں گے جس کی تبلیغ کے لئے قرآن آیا ہے۔

یہ چیزیں درحقیقت خدا کے اعتقاد سے الگ کیونکر کرتی ہیں؟ اس کا رمز ایک دوسرا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو دیکھا جائے تو انسان کا نقطہ خیال نتیجہ کو بدل دیتا ہے، ایک آئینہ آپ اپنے سامنے لایئے، اپنے چہرہ کے دیکھنے کے لئے، اب آپ اس کو جتنا زیادہ دیکھیے گا چہرہ کے خط وخال زیادہ نمایاں ہوتے جائیں گے لیکن اسی آئینہ کو اپنی نظر کے سامنے لایئے صرف آئینہ کی ساخت کو دیکھنے کے لئے اس وقت آپ کو اس کا خیال بھی نہ ہوگا کہ آپ اپنے چہرہ کو دیکھیں کیونکہ اس وقت تو دیکھنا یہ منظور ہے کہ آئینہ کیسا بنا ہے۔ آئینہ کے موجودہ خصوصیات کا دیکھنا مدنظر ہے اب آپ آئینہ کی ساخت ہی کی تعریف کیجئے گا، اس کے خاص جوہر واضح کیجئے اگر آپ کے چہرہ میں کوئی دھبہ بھی ہے تو نظر نہیں آئے گا، تھی نظر آئینہ پر اور آئینہ چہرہ کے سامنے بھی تھا لیکن نظر چونکہ چہرہ پر نہ تھی چہرہ نظروں سے اوجھل رہا۔ حالانکہ نظر اس پر پڑی ضرور کیونکہ وہ اس کا لازمہ طبعی ہے مگر التفات نفس نہ ہونے کی وجہ سے ظاہری نظر بیکار رہی، نظر کو بے نتیجہ کردیا، مقصد جو

آئینہ کا تھا بحیثیت ''آئینہ'' وہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ جسمانی حیثیت کے اعتبار سے مقصد حاصل ہوا۔ یہ ہی صورت ان حقائق قدرت کی ہے کیونکہ ان مصنوعات میں کچھ ان کی طبعی اور مادی حیثیت ہے اور کچھ وہ روشنی ہے جو ان سے پڑتی ہے ان کے خالق کے وجود پر، انسان کی نگاہ آئینہ کے ذاتی حسن و جمال میں ایسا محو ہوئی کہ وہ اسی میں الجھ کر رہ گئی۔ تو اب وہ اس حقیقت کو نظر میں نہ لائے گی جو اس میں مضمر ہے۔

اسی طرح انسان اپنے مادی خواہشات میں ایسا الجھا کہ اس نے اپنی روشنی کو دیکھا ہی نہیں جو موجودات قدرت میں مضمر ہے اس نے نظر بھی نہیں ڈالی اس جمال حقیقت پر جو ان چیزوں میں دکھلائی دے رہا تھا، آپ نے ان چیزوں کو دیکھا اور بہت غور سے دیکھا، ان کے تمام طبعی خواص پر نظر کر کے دیکھا مگر وہ جمال مخفی رہا جو ان میں مضمر تھا یہی وہ چیز ہے جس کو حکیم امت اسلامیہ، باب مدینۃ العلم، نبض شناس مزاج انسانی، مزاج دان فطرت بشری یعنی امیر المومنین علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے دنیا کے وصف میں، ارشاد فرماتے ہیں؛۔

مَنْ اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ وَمَنْ اَبْصَرَ اِلَيْهَا اَعْمَتْهُ۔

ایک مختصر سا کلام ہے مگر اس میں وہ سب ہے جو میں نے اپنے طویل الذیل بیان میں کہا۔

ارشاد ہوتا ہے جو شخص اس دنیا پر خاص طور سے نظر ڈالے تو اسے یہ دنیا اندھا کر دے گی مگر جو اس عینک کو لگا کر دیکھے اس دنیا کو ذریعہ مشاہدہ قرار دے کر دیکھے تو اس کی یہ دنیا آنکھیں کھول دے گی۔ اس کے لئے یہ دنیا بصارت کا باعث ہوگی۔

اس کے معنی یہی ہیں کہ جب آپ دنیا کو مقصد اصلی بنا کر دیکھئے گا تو وہ مقصد حاصل نہ ہوگا جو اسلام کا مقصد ہے لیکن اگر آپ علمی ترقی کیجئے سائنس کو بڑھایئے اس میں اضافہ کرتے رہیئے، مگر شروع سے نگاہ خالق پر رہے تو یاد رکھئے کہ جتنا جتنا آپ سائنس میں ترقی کریں گے اور سائنس کے میدان میں آگے بڑھیں گے اتنا ہی منزل معرفت آپ کے سامنے آتی جائے گی۔ یہ علوم جتنا ترقی کرتے ہیں درحقیقت سرمایہ مہیا کرتے ہیں حقائق اسلام کے منکشف کرنے کا۔ بس فقط ادھر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، تحقیقات جاری رہے سائنس کے متعلق ترقی جاری رہے ابھی تو وقتی حیثیت سے یہ خدا کے وجود کی طرف سے ہٹا رہی ہے یا کم سے کم اقرار پر آمادہ نہیں کرتی

لیکن یہ تمام سائنس کی کتابیں اس کی تحقیقات ایک ذرا نقطہ خیال پلٹنے دیجئے یہی تمام چیزیں خدا کے ماننے کا ذریعہ بن جائیں گی۔

اب ملاحظہ کیجئے، خداوند عالم کی قدرت وحکمت کو ذرا ذرا سی چیزیں دیکھتے ہیں تو آپ کو اضطراب ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کون ہے؟ جتنی اس میں عجیب وغریب صنعتیں زیادہ ہوتی ہیں اتنا ہی زیادہ آپ طالب ہوتے ہیں کہ اس کا بنانے والا کون ہے؟ اگر چہ وہ زیادہ حیرت انگیز بھی نہ ہوں لیکن اگر وہ انتہائی حیرت انگیز بھی ہے تو آپ کو بہت زیادہ اشتیاق پیدا ہوتا ہے موجد کی تلاش کا، آپ میدان میں گذرتے ہیں بہت سے ٹیلے آپ کی نظر سے گذرتے ہیں لیکن کسی سے آپ نہیں دریافت کرتے کہ یہ تودہ ریگ کا کس نے بنایا؟ لیکن اگر اس جنگل میں جہاں دور دور تک آبادی نہیں ہے آپ کو ایک ساختہ و پرداختہ کنواں نظر آئے تو آپ کہیں گے کہ ایک زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آبادی تھی کیونکہ یہاں کنواں بنا ہوا ہے۔ مگر اس کا بنانے والا کون ہے؟ یا کہیں گے کہ خدا اس کا بھلا کرے جس نے یہاں کنواں بنا دیا۔ یہ کس لئے تلاش ہوئی؟ اس لئے کہ اس تودہ ریگ میں نہ تو کوئی خاص غایت نظر آتی تھی، نہ کوئی حکمت مضمر معلوم ہوتی تھی لیکن یہاں کنواں کھدا ہوا ہے زمین میں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی باشعور آدمی نے اس کو یہاں بنایا ہے، اس لئے فکر ہوئی اگر نہایت عمدہ عمارت ہوتی تو آپ کہتے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بادشاہ یہاں سے گذرا ہے۔ یہ عمارت اس کی بنوائی ہوئی ہے، لہٰذا جتنی صنعت زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی زیادہ انسان کی فطرت اس کے موجد کی طرف انتقال کرے گی۔ جس وقت دنیا کی تحقیقات محدود تھیں اور صنعتیں انسان کے لئے نمایاں نہ ہوتی تھیں، اتنی ان میں ندرت بھی زیادہ نہ تھی، اب جتنا سائنس زیادہ ترقی کرے گی اتنے ہی زیادہ حیرت انگیز رموز واسرار منکشف ہوتے جائیں گے لہٰذا اب تو جذبہ موجد کی تلاش کا اور بھی زیادہ بڑھتا جائے گا اور اب تلاش حقیقت اور زیادہ آسان ہوتی جائے گی ایک وقت انسان ظاہری شکل کو دیکھتا تھا حیرت کرتا تھا کہ یہ حکمت کی باتیں ہیں یہ رموز قدرت ہیں لیکن اب جس وقت ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ خالق کتنا باریک نقاش ہے کہ اتنے سے مختصر انگوٹھے میں جس کے نقش ہماری نظر کے سامنے پورے طور سے دکھلائی بھی نہیں دیتے مگر کس قدر قادر بنانے والا ہے کہ اس نے اتنی سی جگہ میں ایسے

نقوش بنائے ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔

یاد رکھیئے میں جو آپ سے عرض کرتا ہوں کہ دنیا ایمان لائے ہوئے ہے اس صنعت اور اس کے استحکام پر، اس صنعت کے ناقابل تبدیل ہونے پر کہ یہ قانون بدلے گا نہیں، یعنی ایک غیر مقتدر انسان ایسے نقوش بناتا ہے جو کبھی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں کبھی الگ ہو جاتے ہیں لیکن اگر کسی ایسے قادر کے قائم کیے ہوئے نقوش ہیں جس کا ہاتھ کبھی دھوکا نہیں کھاتا جس کے قلم میں کبھی لغزش نہیں ہوگی تو اس کے بنائے ہوئے نقوش پر اور ان کے استحکام پر اتنا اعتماد بھی ہوگا کہ مہر معتبر نہیں، دستخط معتبر نہیں کیونکہ بنائی جاسکتی ہے مگر یہ نقوش معتبر ہیں اس لئے کہ معلوم کہ بس ان کا ایک ہی بنانے والا ہے۔

اور کوئی نہیں اور وہ ایسا بنانے والا ہے کہ اس کا قلم کبھی چوکتا نہیں یہ کب منکشف ہوا؟ یہ اس وقت منکشف ہوا جب علم تشریح نے ترقی کی یہ اس وقت منکشف ہوا جب سائنس دنیا کے سامنے آئی، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جتنا سائنس ترقی کرتی جائے گی خدا پر ایمان اور زیادہ ہوتا جائے گا۔

اسلام اور حریت عقل

دنیا کے وہ مذاہب انتہا سے زیادہ کمزور ہیں جن میں تحقیق کو خطرہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جنھوں نے اپنی مذہبی عقائد کے سلسلہ میں پردہ پوشی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے حلقہ بگوشوں کے لئے جرم قرار دے لیا ہے کہ وہ مذہبی گفتگو کریں، یہ کیا ہے؟ انہیں اپنے مذہب کی اصلی بنیادوں کے کمزور ہونے کا احساس ہے لہٰذا وہ جانتے ہیں کہ ادھر گفتگو ہوئی اُدھر شیشۂ عقائد پر سنگ اعتراضات کی بارش ہوئی۔ عیسائی مذہب جو آج کل تبلیغ میں مصروف ہے دنیا جانتی ہے کہ اس کے تمام رہنماؤں کا یہی طرز عمل رہا کہ ان کی مذہبی کتابیں دوسروں کے ہاتھوں تک نہ جانے پائیں۔ چند خاص افراد تھے جن کے پاس مذہبی کتابیں محدود رکھی جاتی تھیں، کسی کو حق نہ تھا کہ وہ مذہبی کتابوں کو دیکھ سکے جب دیکھے ہی گا نہیں تو رائے کیا قائم کرے گا۔ لطف یہ ہے کہ آج بابی یا بہائی مذہب جس کے ماننے والے اس کو اپنے تئیں انیسویں بیسویں صدی کا رہنما قرار دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری تعلیمات جدید ظرف زمانہ کے مطابق ہیں، اس کی مذہبی

کتابوں میں بھی یہ حکم موجود ہے کہ:۔

''کور شاتا جمال من بنی کر شوتا صدائے من بشنوی''

اندھے بنو جب ہماری حقیقت کا جلوہ تم کو دکھائی دے گا، بہرے بنو تب جا کر ہمارا کلام تم پر اثر کرے گا۔

ادھر یہ تعلیم ہے، مگر اسلام جو تیرہ سو سال سے اپنے واحد ہونے کا اظہار کر رہا ہے وہ اندھوں کی مذمت کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا.

وہ اندھے بننے کو نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ آنکھوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟ وہ بہرا ہونے کو نہیں کہتا بلکہ وہ کانوں پر سے پردے ہٹانے کو کہتا ہے ''وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ'' ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

درحقیقت اسلام صحیح تعلیم کو ترقی دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہمارے حقائق دنیا کے سامنے منکشف ہوں، عقل وہی عقل جس کو بہت سے لوگوں نے اپنے لئے انتہا سے زیادہ خطرناک سمجھ لیا، اس کے لئے معلم الاسلام کا ارشاد ہے:۔

مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ لَا دِيْنَ لَهُ

جس کے لئے عقل نہیں ہے اس کے لئے دین نہیں ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دین کی بنیاد عقل پر قرار دی گئی۔

یہ ارشاد ہوا:۔

''العقل ما یرضیٰ بہ الرحمٰن ویکتسب بہ الجنان''

عقل وہ ہے جس کی وجہ سے خدا خوش ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان باغ بہشت کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہ دنیا کی کوتاہ نظری ہے کہ اس نے عقل حیلہ بازی کو قرار دے لیا۔ ان معنوں سے اگر عقل کو غلط استعمال کیجئے تو عقل نہیں ہے یہ شیطنت ہے۔ عقل تو خیر محض ہے، عقل تو خدا کی حجت

ہے، عقل کو خدا نے اپنی طرف سے سفیر بتایا ہے، عقل! اگر درحقیقت عقل ہو تو وہ معصوم ہے، عقل خطا سے منزہ ہے۔ لیکن جس طرح غلط دعویداران نبوت بھیس بدل کر انسان کو گمراہ کرتے ہیں اسی طرح قوت واہمہ عقل کا لباس پہن کر انسان کے سامنے آتی ہے۔ عقلاء کے اقوال میں اختلاف ہوتا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ان کے اقوال میں سے ہر قول مطابق عقل ہی ہوتا ہے، عقول اختلاف رکھتے ہیں لیکن درحقیقت عقل ان میں سے ایک ہی کی موید ہوتی ہے اور ان دوسرے اقوال سے بیزار ہے پھر وہ مختلف اقوال میں فیصلہ کرنے والی ہے۔

ایک قیاس یعنی عقلی دلیل کی مرتبہ شکل میں عقل ہی غلطی کی گرفت کرتی ہے، عقل رہنما ہے مگر پردہ میں ہے اس لئے ہر مکار عقل کا لباس پہن کر انسان کے سامنے آتا ہے اور گمراہ کرتا ہے لیکن عقل اپنے فیوض باطنی سے حیلہ بازی کا پردہ چاک کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ دلیل یہاں سے باطل ہے۔ اصول مذہب درحقیقت تمام تر عقل پر مبنی ہیں۔ بتایئے خدا کے وجود پر ایمان کس طرح لائیں؟ قرآن میں دیکھ کر خدا ہے ایمان لائیں؟ اگر خدا ہے نہیں تو قرآن کیسا؟ پھر خدا کے وجود پر اگر ہم ایمان لائیں تو سوائے اس کے کہ عقل کے دامن کو تھامیں اور کس طرح سے ایمان لا سکتے ہیں۔ رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانا چاہتے ہیں تو کیا خود ان کے ہی کہنے سے ان پر ایمان لائیں؟

درحقیقت سب سے پہلی تصدیق کرنے والی رسالت کی عقل ہے، اگر عقل نہ ہوتی تو انبیاء ورسل کی آوازیں پکارتے پکارتے تھک جاتیں، ان کی صدائیں خاموش ہو جاتیں اور دنیا سننے پر مجبور نہ ہوتی۔ لیکن عقل ہی وہ چیز ہے جو لاتی ہے دنیا کو رسولؐ کی آواز کی طرف۔ درحقیقت عقل وہ ہے جو سب کچھ ہے، پھر دنیا کی ہر حقیقت ہمیشہ عقل سے ثابت ہوتی ہے۔ غلط ہے ان کا قول جو کہتے ہیں کہ ہم اپنی معلومات کی بنیاد احساس پر رکھتے ہیں۔ احساس کبھی انسان کو حقانیت اور صداقت تک نہیں پہنچا سکتا، جب تک عقل کا قدم درمیان میں نہ ہو، میں آپ کو ایک آسان مثال دے کر بتاؤں۔

بجلی کا پنکھا جس وقت تک وہ ساکن ہے اس میں تین پر نظر آئیں گے لیکن جس وقت وہ حرکت کرنے لگے گا تو اب آپ مشاہدہ کیجئے گا وہ ایک واحد طبق دکھائی دے گا۔ اگر صرف احساس پر ہم اپنے عقیدہ کی بنیاد قرار دیں تو سمجھنا پڑے گا کہ شکل میں تبدیلی واقع ہو گئی۔ جو چیز

تھی وہ فنا ہوگئی، اب دوسری چیز ہوگئی، پہلے تین پر تھے اب نہ معلوم کس طرح سے ان میں اتصال ہوگیا لیکن عقل ہی ہے جو اس راز کو منکشف کرتی ہے کہ اب بھی وہی تین پر ہیں جو پہلے تھے لیکن حرکت کی سرعت کی وجہ سے چونکہ اس کے وجود کا ایک جز خیال سے نہیں مٹنے پاتا کہ دوسرا اس کی جگہ آجاتا ہے، دوسرا نہیں مٹنے پاتا کہ تیسرا اس کی جگہ آجاتا ہے۔ لہٰذا وہ سب ایک ہوکر شکل ایک طبق کی پیدا کرتے ہیں مگر ہیں وہی تین پر جو پہلے تھے، ہماری نظر کا پھیر ہے کہ ہم کو صرف ایک طبق ہی دکھائی دیتا ہے یہ حقیقت کا انکشاف عقل نے کیا۔

ایک انسان کو آپ ایک بلند منارہ پر سے جاکر دیکھئے تو وہ چھوٹا نظر آئے گا، وہاں سے اتر آیئے نیچے کی سطح پر تو اب کچھ بڑا معلوم ہوگا جب بالکل قریب سے دیکھئے تو اتنا ہی نظر آئے گا جتنا آپ عام طور سے دیکھا کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف نظر ہی پر اپنی بنیاد قرار دیں تو ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ آدمی بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے، اس وقت وہ چھوٹا تھا اب بڑا نظر آتا ہے، حقیقتاً اس میں یہ انقلاب ہوا؟ لیکن عقل حقیقت کا انکشاف کرتی ہے عقل یہ کہتی ہے کہ نہیں! یہ جتنا تھا اتنا اب بھی ہے لیکن شرائط رویت کی بنا پر مسافت ایک خاص معیار پر اگر ہے تو وہ اس شئے کو اتنا ہی دکھلائے گی جتنی وہ ہے لیکن اگر مسافت میں کچھ بُعد پیدا ہو جائے تو جتنا وہ ہے اس سے چھوٹا دکھائے گی، شے ایک ہی رہتی ہے لیکن نظر کا پھیر ہے جو چھوٹا اور بڑا بنتا ہے۔ یہ کس نے انکشاف حقیقت کیا؟ عقل نے کیا۔ حالانکہ ہماری حس دھوکا کھا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ جتنے حسیات ہیں ان میں واقعیت کی شناخت عقل ہی پر ہے۔

لیکن یاد رہے کہ عقل وہیں تک کام کرتی ہے جتنا عقل خود مدعی ہے کام کرنے کی لیکن اگر کسی جگہ عقل خود حکم لگائے کہ یہ میرا شعبہ عمل نہیں ہے، عقل خود کہے کہ اس میں میرا بس نہیں ہے تو وہاں عقل سے کام لینا خود عقل ہی کے فیصلہ کے خلاف ہوگا، اس لئے اس سے کام لینے کے بعد اگر بظاہر آپ کی عقل کسی نتیجہ تک پہنچائے تو وہ نتیجہ بھی عقل کا کچھ صحیح نتیجہ نہ ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اصولی عقائد بے شک وہ ہیں جو تنہا عقل ہی کے ذمہ ہیں۔ ان اصولی عقائد اور مذہب کی بنیادوں کو عقل سے دریافت کیجئے۔ لیکن جب ان کی بنیادوں کو صحیح طریقہ سے مضبوط کرلیجئے تو اس مذہب کے فروع اس کے قوانین وقواعد اس کے عملی احکام ان میں یہ ضروری نہیں

ہے کہ آپ کی عقل ہر جگہ صحیح نقطہ تک پہنچ جائے، یعنی خدا کے وجود کو آپ عقل سے سمجھئے، اس کے صفات ثبوتیہ وسلبیہ سب عقل سے دریافت کیجئے، رسولؐ کی رسالت عقل سے دریافت کیجئے لیکن رسولؐ کوئی قانون لے کر آتا ہے، کچھ قواعد خدا کی طرف سے عملی تربیت انسان کے لئے لے کر آتا ہے اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ عقل کا فیصلہ خود اس کے فیصلہ کے متضاد ہو جائے، عقل نے رسولؐ کی رسالت کو ضروری سمجھا، اس لئے کہ انتظام بشری کے لئے، نظام اجتماعی کے لئے ضروری ہے کہ ایک قانون اور آئین ایک ایسی ہستی کا بنایا ہوا ہونا چاہیے جو تمام افراد بشر کی صحیح مزاج داں ہوں، جو نظام انسانی سے صحیح طور سے باخبر ہو۔ عقل نے یا تو رسولؐ کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہوتی تب اس کے معنی یہ ہوتے کہ اصل محل اختلاف ہے لیکن اگر عقل نے رسولؐ کی ضرورت سمجھ لی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جزئی قواعد کے لئے صرف عقل انسانی کافی نہیں ہے یہ فیصلہ خود عقل نے کیا اگر ایسا نہ ہوتا تو رسولؐ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عقل ہر شخص کے دماغ میں موجود ہے وہ خود ہی ایک لائحہ عمل بنا سکتی ہے۔ لیکن عقل اس وادی میں آکر عاجز نظر آتی ہے اس لئے کہ عقل ہر شخص کے لئے انفرادی حیثیت رکھتی ہے بیشک اپنے ذاتی حالات سے ہم پورے طور پر مطلع ہیں لیکن عقل انفرادی ہرگز اجتماعی حیثیت سے بصارت وبصیرت نہیں رکھتی، یعنی نظام عالم میں جتنے اجزا کہ داخل ہیں ان پر کسی عقل کو عبور حاصل ہوا ایسا نہیں ہے، قانون تو ایسا ہونا چاہیے جو تمام اجزائے عالم کے مناسبات سے تمام افراد کے معیار طبع، خصوصیات شخصی واجتماعی، ہر شخص کے مصالح وحکم کے لحاظ سے مجموعی حیثیت سے جن کا لحاظ ضروری ہو بنایا گیا ہو کسی انسان کی عقل انسانی حدود میں کبھی اس کی دعویدار نہیں ہو سکتی کہ تمام افراد کے خصوصیات جزوی واجتماعی کی طورے طورے سے عالم ہے اور جب وہ پورے طور سے واقف نہیں تو وہ کوئی قانون بھی ایسا نہیں بنا سکتی جو بوقت واحد تمام عالم کے انتظام کے لئے کافی ہو چونکہ عقل حق شناس ہے، عقل حقیقتاً معصوم ہے میں نے کہا کہ عقل کبھی غلطی نہیں کرتی، لہٰذا عقل اپنی اس کمزوری کو بھی جانتی ہے وہ اپنے درجہ منزلت کو سمجھتی ہے، اس لئے عقل انسان دنیا کے قانون کی ساخت کے لئے ضرورت سمجھتی ہے معلم قدرت کی کہ وہ اس قانون کو بنائے وہ بے شک تمام افراد انسانی کے انتظام کے لئے کافی ہوگا، جب عقل نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تو پھر اب عقل کو کیا حق ہے کہ وہ جزئی باتوں میں پوچھے کہ یہ کیوں ہے اور

یہ کیوں ہوا؟ یا تو رسولؐ کی رسالت کی ضرورت ہی نہیں۔

اس مرحلہ کو ضرور طے کر لینا چاہیے، یہ بے شک عقل سے متعلق ہے، رسولؐ کی رسالت کو تسلیم کرنے کے بعد اب عقل کسی شخص خاص کی رسالت کو نہیں تسلیم کرتی، وہ کہتی ہے کہ بے شک رسالت ضروری ہے مگر یہ شخص خدا کا فرستادہ نہیں ہے۔ اب آیئے معیار رسالت عقل ہی کے رو سے مقرر کیجئے۔ دیکھئے وہ کیا شناخت قرار دیتی ہے کہ رسول کی رسالت کون کون باتوں پر مبنی ہے۔ یہ قرآن میں دیکھنے کی چیز نہیں، یہ حدیث میں دیکھنے کی چیز نہیں اس کو بے شک عقل سے سمجھئے لیکن جب معیار رسالت عقل کے ذریعہ سے طے ہو جائے تو ہم یہ دیکھیں کہ اس شخص میں یہ امور پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ اگر پائے جاتے ہیں تو عقلاً وہ رسول ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں پوری دلیل عقلی ہمارے سامنے پیش ہو جائے گی کہ یہ شخص ایسا ہے جس میں یہ معیار پایا جاتا ہے لہٰذا یہ رسول ہے ضرور جب یہ طے ہو گیا عقل نے معیار رسالت بھی بنا لیا اور وہ کسی شخص خاص میں پایا بھی گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کی طرف سے رسول ہے اور اس کا قانون خدا کی طرف سے ہے، اس نے کہا ''مغرب کی تین رکعتیں، ظہر کی چار رکعتیں'' اور ''صبح کی دو رکعتیں'' اب عقل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کہے کہ یہ کیوں اور وہ کیوں؟

ایک بادشاہ ہے، اس کے ارکان حکومت کے لئے عقل یہ ضروری سمجھتی ہے کہ وہ ارکان حکومت جس وقت کہ اس کے دربار میں جائیں تو آداب دربار پر عمل کریں رسوم دربار کو اپنے پیش نظر رکھیں، کسی نے اگر رسم دربار کے خلاف کیا، عدول حکمی کی، اس کو سزا دی جائے تو عقل کہے گی کہ بے شک مستحق سزا ہے لیکن آداب و رسوم دربار کیا ہیں؟ خود عقل کہے گی کہ یہ آداب و رسوم دربار قرارداد سے تعلق رکھتے ہیں جو جس دربار میں قرار پا گئے ہوں۔

بے شک چونکہ عقل کے فیصلہ کے مطابق حضرت احدیت حکیم علی الاطلاق ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت و مصلحت کی حد سے باہر نہیں جاتا ہے اس لئے جو حکم وہ دے گا چاہے وہ عبادت سے تعلق رکھتا ہو چاہے معاملات سے تعلق رکھتا ہو اس میں کوئی نہ کوئی خاص حکمت و مصلحت ضرور مضمر ہوگی۔ ہم وہ نہیں ہیں جو یہ کہیں کہ حکم الٰہی میں کوئی مصلحت نہیں ہوتی اور اگر خدا چاہے تو بری بات کا حکم دے دے وہ اچھی ہو جائے گی حکم کی وجہ سے، خدا کو کسی مصلحت پر نظر کرنے کی ضرورت

نہیں ہے ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز میں حکم و مصالح ضرور ہیں مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی حکم جو حضرت احدیت کی طرف سے آئے اور ہمارے لئے ثابت ہو جائے تو ہمیں مجمل طور سے سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم ہی نہ ہوتا مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مصلحت ہماری عقل بھی سمجھ لے، اس لئے کہ عقل مخلوق اور حکمت خالق میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عقل کبھی قاصر بھی رہتی ہے میں نے یہ کہا کہ عقل معصوم ہے یعنی غلط حکم نہیں لگاتی، لیکن ہر جگہ حکم بھی لگاتی ہے اور سمجھ بھی لیتی ہے؟ ایسا نہیں ہے جہاں عقل نہیں سمجھتی وہ خود کہہ دیتی ہے کہ میں نہیں سمجھتی جہاں قاصر رہتی ہے کہہ دیتی ہے کہ میں قاصر ہوں۔ یہ اس کی سچائی ہے اور یہی اس کی عصمت ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عقل انسان ہر بات کو سمجھ لیتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو علم ترقی کیونکر کرتا، اس کی ترقی یوں یہی ہوتی ہے کہ بعض باتیں پردہ خفا میں تھیں جو بعد میں ظاہر ہوئیں، ایسے ہزار ہا رموز تھے جو ایک زمانہ میں افکار عقلی سے مخفی تھے۔ اب علمی ترقی نے ان اسرار کو منکشف کیا، باوجود اس کے کہ دنیا انتہائی مدارج کمال پر علمی حیثیت سے پہنچ گئی ہے مگر ہمارا کمال یہی ہے کہ اب ہم سمجھنے لگے ہیں کہ ہم ابھی کچھ نہیں سمجھے، در حقیقت کل اس کا اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ جو معلومات منکشف ہونے والے ہیں وہ ایسے ہوں گے جن کے مقابلہ میں اس وقت تک کے معلومات ہیچ ہو جائیں گے، ایک بہت بڑا سمندر کا پاٹ ہم کو طے کرنا باقی ہے، اگر زمانہ مستقبل میں حالات مساعد ہوئے تو ممکن ہے کہ ہم اس سمندر کے وسط تک پہنچ جائیں اس کے یہ معنی ہیں کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اب تک انسان کی عقل سے پوشیدہ رہی ہیں، دنیا کہتی ہے کہ آج ہم سمجھے کہ ابھی تک ہم کچھ نہیں سمجھتے تھے اور وہ جو بتلانے والا تھا اس نے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا:۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔

یہ علمی ترقی و علمی انکشافات جو روز بروز ہوتے رہتے ہیں یہ دلیل ہیں اس بات کی کہ ہم ابھی تک جاہل ہیں۔ ہماری عقلیں نشو و نما کر رہی ہیں مگر نشو و نما وہی کرتا ہے جو کامل نہ ہو کمال کے بعد کوئی درجہ ترقی کا نہیں رہتا، روز بروز جدید معلومات کا حاصل ہوتے رہنا بتلاتا ہے کہ ہماری عقل ابھی کمسن ہے، ہماری عقل ابھی نوخیز ہے، ابھی نشو و نما اور بڑھنے کا زمانہ ہے پھر ان نوعمر عقلوں پر ہم اس خدائے حکیم کے احکام کے تمام رموز کو سمجھ لینے کا دعویٰ کریں جو ازل سے ابد تک

ہر چیز پر محیط ہے۔اس کے علم میں تدریج نہیں ہے یہ نہیں ہے کہ پہلے نہیں معلوم تھا۔اب معلوم ہوگیا۔جب ہمارا علم اتنا محدود ہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ تمام اسرار پر نظر کریں یہ یقین کر کے کہ ہم ان کو ضرور سمجھ لیں گے، بے شک یہ علم کی ایک خامی ہوگی کہ ہم رموز و اسرار کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ممانعت نہیں ہے کہ آثار قدرت میں غور کیجئے اس کے احکام میں تامل و تفکر کیجئے ممنوع نہیں ہے لیکن آپ اس کے احکام کے پابند ہونے میں انتظار کیجئے ان کی مصلحت کو سمجھ لینے کا،تب پابند ہو جیسے ایسا نہیں ہے پابندی اس لئے کرنا چاہیے کہ خدا کا حکم ہے غور کیجئے اس لئے کہ حکم دینے والا حکیم علی الاطلاق ہے اگر ہم اس کی مصلحت کو سمجھ لیں تو ایک علمی ترقی ہے اسلام نے راستے کھول دیئے ہیں اسی کی بناء پر احکام کی مصلحت پر غور کیجئے ،ائمہ معصومینؑ نے علل شرائع بیان کئے ہیں اسی شوق کے پیدا کرنے کے لئے عقل سے احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔غور کریں کہ اس میں کتنی بڑی بڑی حکمتیں مضمر ہیں،قرآن مجید میں بہت سے احکام کے ساتھ ان کے حکم و مصالح بھی بیان کئے ہیں یہ سب اسی لئے ہے کہ ایک طرف آپ عملی حیثیت سے پابند ہوں دوسری طرف علمی ترقی کا دروازہ بھی کھلا رہے یعنی احکام کے مصالح پر غور و فکر اگر کوئی علمی رقی کے لئے کرنا چاہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ہمارے بہت سے روشن خیال حضرات احکام کے اسرار کو پوچھا کرتے ہیں۔یاد رکھنا چاہیے کہ ہم حضرت احدیت کے احکام کے اصلی رموز و مصالح سے اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دسرے افراد اگر فرق ہے تو اصل احکام کے جاننے اور نہ جاننے میں ہے لیکن احکام کے رموز و مصالح ان میں ہم اور وہ مساوی حیثیت سے بے خبر ہیں۔ہاں! چونکہ کچھ نہ کچھ ہماری نظر احادیث پر بھی ہے ممکن ہے کہ مختلف قسم کے نظائر کے دیکھنے سے ہمارا ذہن بہ نسبت دوسرے اشخاص کے ذہن کے جلد پہنچے لیکن بحیثیت ایک انسان ہونے کے خالق کی حکمت سے مخلوق کو کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ہم بھی اسی طرح سے بے خبر ہیں جس طرح سے وہ شخص جو اپنے تئیں ناواقف کہتا ہے،وہ بے خبر ہے۔بے شک تبادلہ خیالات کا حق ہے علمی تحقیقات کی حیثیت سے لیکن عملی پابندی کی حیثیت سے نہیں۔کیونکہ اگر علمی پابندی کو احکام کی وجہ دریافت کرنے پر معلق رکھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم خدا کے حکم کے پابند نہیں ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مالک نے یہ حکم دیا کہ اس وقت یہ خدمت بجالاو اگر وہ دانا ہے تو ضرور کوئی حکمت مدنظر رکھے گا۔ لیکن غلام کو یہ حق نہیں ہے کہ پوچھے کہ اس میں کیا رمز ہے۔ دنیا کو غلطی نہ ہو کہ میں نے غلام بنا دیا تو اسلام غلامی کا حامی ہو گیا! یہ غلام خدا کا غلام ہے ممکن ہے میں اس کو مستقل طور سے بیان کروں کہ خدا نے انسانیت کو اپنی غلامی اور عبودیت کو اسی لئے یاد دلایا ہے کہ اس عبودیت کو فنا کردے جو دنیا میں رائج ہو گئی تھی "اَلْعُبُودِيَّةُ جَوْهَرٌ كُنْهُهَا الرُّبُوبِيَّةُ" خدا کی عبودیت ایک جوہر ہے جس میں حریت کے راز مضمر ہیں۔ یہ غلامی وہ ہے کہ جو ناز کا باعث ہے سرمایہ ننگ نہیں ہے بلکہ سرمایہ ہزار افتخار ہے۔

درحقیقت علمی حیثیت سے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ آپ احکام پر غور کیجئے ان کو واجب الامتثال سمجھ لینے کے بعد غور کیجئے کہ ان میں کیا کیا حکمتیں اور مصالح مضمر ہیں یہ درحقیقت وہ صورتیں تھیں جو اسلام نے دنیا کو علمی ترقی میں آگے بڑھانے کے لئے پیش کیں، عقائد کو عقل پر مبنی قرار دیا۔ مذہب کے اصول کو عقل پر مبنی قرار دیا یہ کہا کہ عقل نہ ہو تو عبادت ناقص ہے اس لئے کہ عبادت میں روح پیدا ہو جاتی ہے نیت کی وجہ سے "اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" اور عقل جتنی کامل ہوگی نیت میں جہت کمال زیادہ پیدا ہو سکے گی، اسی لئے بتلایا گیا کہ جتنی عقل ہو انسان میں اتنا ہی اجر ملے گا۔ اصول کافی میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک شخص عابد تھا، ایک جزیرہ میں عبادت خدا میں دن رات بسر کرتا تھا ایک فرشتہ کا گذر ہوا فرشتہ کو تعجب ہوا اس کی عبادت پر بارگاہ الٰہی میں تمنا ظاہر کی اسبات کی کہ وہ اس کے ثواب کو جان لے۔

وہاں سے ثواب جو پیش ہوا وہ نظر ظاہر میں کم معلوم ہوا اس عبادت کے مقابلہ میں۔ معلوم ہوا کہ وہ عابد ظاہری حیثیت سے بہت زیادہ عبادت کرتا ہے مگر قوت عاقلہ کمزور ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ عمل کا ثواب گھٹ گیا جتنا زیادہ خلوص ہوگا اتنا ہی عبادت میں وزن زیادہ پیدا ہوگا یہ نہ سمجھے گا کہ ظاہری عبادت زیادہ ہے تو اجر بھی زیادہ ہے خلوص کم ہے تو ثواب کم ہے ظاہر کو نہ دیکھئے باطن پر نظر ڈالئے۔

جتنی قوت عقل زیادہ ہوگی اتنا ہی خلوص پیدا ہوگا، اور جتنا خلوص زیادہ ہوگا عمل بلند ہوگا۔

اگر کوئی عابد محراب عبادت میں زندگی گذار دے اور علمی ترقی سے الگ رہے اور ترقی کا

عذر عبادت کو قرار دے تو اس کے سد باب کے لئے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ عبادت قبول نہیں ہے جو علم و عقل کے ساتھ نہ ہو۔

جناب رسالت مآب فرماتے ہیں:۔

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى اَدْنَاكُمْ.

عالم کی فضیلت عابد پر اتنی ہے جتنی ایک نبی کو فضیلت ہوتی ہے ایک فردامت پر۔

اس طرح سے علم و عقل کے معیار کو بلند کیا گیا، اور علمی ترقی کا دروازہ کھولا گیا:۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ.

حدیث اتنی ہی ہے اس لئے میں نے اتنی ہی پڑھی "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے" وہ علم کونسا ہے؟ یہ دوسری چیز ہے۔ بے شک جو علم ہو اس کو فرض قرار دیا گیا ہے یہ مسلمان کہ وہ اس کو حاصل کرے۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ.

خدا کا خوف اگر کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہو تو وہ وہی لوگ ہیں جو علم کے رکھنے والے ہیں۔ ارشاد فرمایا:۔

لَا يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ.

کبھی برابر نہیں ہو سکتے وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔

ارشاد فرمایا:۔

أَفَمَنْ جَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا.

کیا وہ شخص جس کے لئے ہم نے نور قرار دیا ہے جس کی شعاعوں میں وہ راستہ طے کرتا ہے وہ اس کے مثل ہو سکتا ہے جو تاریکی میں ادھر ادھر ہاتھ پیر مار رہا ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَالْأَمْوَاتُ.

علم و جہل کی مثال۔ علم کو حیات قرار دیا اور جہل کو موت، علم کی ترقی کے راستوں کو کھولا، ہر شعبہ میں علمی ترقی کو کہا:۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ.

جو در حقیقت علم کے راستے پر چلتے ہیں ملائکہ ان کے پیروں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔

یہ کہا کہ:۔

”تستغفر لهم الحيتان فى المآء والطير فى الهواء“

ان کے لئے مچھلیاں دریا میں اور طائر ہوا میں استغفار کرتے ہیں۔

در حقیقت اسلام ہی دنیا کا وہ مذہب ہے جو صحیح طریقہ سے دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے دنیا کو علم کے راستہ پر چلنے کی بحیثیت مذہب کے دعوت دی، دنیائے مذہب کے ذرہ ذرہ کو چھان ڈالئے مگر آپ کو علم کی اتنی حمایت نہ ملے گی جتنی قرآن میں اور حدیث میں ملتی ہیں۔ اسی طرح اسلام دنیا میں علمی ترقی کا صحیح رہنما بن کر آیا ہے اس کے مقابلہ میں کوئی مذہب نہیں آ سکتا۔

اسلام اور عملی ترقی

دنیا میں افراد انسانی نے امتیاز باہمی کے معیار قائم کر لئے تھے مادہ پرست دنیا مال و دولت کو سبب افتخار سمجھتی تھی، سلطنت و حکومت کو سبب عزت سمجھتی تھی، بہت سے لوگ ایسے تھے جو کسی بڑے کی طرف انتساب کو سرمایہ افتخار سمجھتے تھے، گورے رنگ والے کالے رنگ والوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے، کسی خاص شخص کی اولاد والے دوسری نسل والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انہی چیزوں نے کمالات انسانی کو خاک میں ملا دیا تھا، انفرادی ترقیوں کے راستوں کو بند کر دیا تھا اس لئے جو شخص وقار حاصل کرنا چاہے اس کو انہی چیزوں کی ضرورت تھی، ایک عزت کا طالب مال و دولت کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، ایک عزت کا طالب سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، جو لوگ ایسے تھے جنہیں قدرت نے کسی خاص خاندان میں پیدا کر دیا تھا ان کو تو یہ عزت بغیر کسی محنت کے حاصل تھی، نہ کہیں فوج کشی کی ضرورت تھی اور نہ محنت و مشقت کے برداشت کرنے کی حاجت۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا اپنے نفوس کو اخلاق سے سجنے کی طرف متوجہ نہ ہوئی، کسی کو اس کی ضرورت نہ محسوس ہوئی کہ وہ اچھا آدمی بنے تاکہ اس کی تعظیم کی جائے، ایک یہ چیز تھی جو قوت عمل

کے کمزور ہونے کا باعث تھی۔ دوسرے مذہب کے غلط نظریات جو قائم ہو گئے تھے جیسے نصاریٰ کا عقیدہ "فدیہ" کہ مسیح سولی پر چڑھ گئے لہٰذا ہمارے تمام گناہوں کے ذمہ دار بن گئے اور اب ہمارے لئے کوئی حکم نہیں ہے ہم آزاد ہیں یہ خیال وہ تھا جس نے قوت عمل کو کمزور کر دیا۔

تیسری طرف عبادت کے مفہوم کا غلط سمجھ لینا کہ عبادت صرف تنہائی کے مقام پر بیٹھ کر یاد خدا کر لینا ہے، اس لئے عیسائیوں نے رہبانیت کو اختیار کیا کہ پہاڑوں پر، غاروں میں تنہائی میں بیٹھ کر خدا کی یاد کیا کریں۔

چوتھی طرف نصاریٰ و یہود میں ایک غلط خیال یہ قائم ہو گیا تھا کہ چونکہ ہم اس کے سچے رسولوں پر ایمان لانے والے ہیں لہٰذا ہم اس کے محبوب ہیں تو بھلا ہم کو وہ سزا کیوں دینے لگا، قرآن مجید میں ان کے قول کا تذکرہ موجود ہے "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" "ہم خدا کے فرزند ہیں اور اس کے دوست ہیں۔ اس کے بعد جو نتیجہ اس سے ان کی ذہنیت کی باعث نکلتا تھا اس کی تشریح کر دی ہے "فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ" "تو اب وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دینے لگا؟

یہ تمام باتیں وہ تھیں مثالاً جو دنیا کے معیار کو پست کر رہی تھیں جو دنیا کو عملی حیثیت سے بے حس بنا رہی تھیں، لیکن اسلام نے ایک طرف اس ذہنیت کو کہ دنیا میں سب افتخار مال و دولت قرار دے لیا گیا تھا یہ کہہ کر باطل کیا:۔

"لا فخر للعربي على العجمي ولا للقرشي على غير القرشي"

کوئی فخر نہیں ہے عرب کو عجم پر نہ قرشی کو غیر قرشی پر۔

اس طرح نسل انسان کے افتخار کو باطل کیا گیا "بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ" "میں سرخ و سیاہ سب کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ کسی کو کسی پر فخر نہیں ہے۔ اس پر قرآن مجید نے نسلی امتیاز کو یہ کہہ کر باطل کیا "اِنَّمَا جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا" "ہم نے تم کو مختلف قبیلوں میں جو الگ کیا ہے تو اس لئے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو، یعنی ناموں کے اشتراک کی وجہ سے شبہ نہ ہو "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ" "لیکن تم میں معزز سب سے زیادہ وہی ہے جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو، اس طرح سے نسلی امتیاز کو غلط ثابت کیا، ملکی امتیاز کو باطل کیا۔ ارشاد ہوا کہ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" "جو بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے وہ سب

ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ دنیا نے مختلف قسم کے معیار بنا لئے تھے، کچھ لوگوں نے ملکی تفریق قائم کی تھی، کچھ لوگوں نے نسلی تفریق قائم کی تھی اسلام نے ایک ہیئت اجتماعی اسلام کی تشکیل کی جب سب رشتہ دار ہو گئے تو پھر تفوق ایک کو دوسرے پر کیسا؟ یہ حد تھی ملکی تفریق کو مٹانے کی کہ ملک حبش کے رہنے والے بلال جو اتفاق سے سیاہ رنگ بھی ضرور تھے ان کو یہ امتیاز خصوصی عطا کیا گیا کہ نماز کے لئے اذان دینے والے وہی ہوں، ایک طرف شہرت و اعلان، سب گمنام اور خاموش لیکن موذن سربلندی کے ساتھ اپنی آواز کا سنانے والا، دوسری طرف ایک حیثیت سے رہنما، راستہ دکھلانے والا، لوگ سونے والے، وہ جگانے والا، لوگ غافل وہ ایک خبر دینے والا، پھر یہ امتیاز کچھ طبیعتوں پر گراں بھی گذر رہا تھا لوگوں کو کھل بھی رہا تھا کہ یہ امتیاز خصوصی رسولؐ کی بارگاہ سے اس شخص کو عطا ہو جائے جو ''ش'' کو ''س'' کہتا ہے لیکن کیا کہنا اس رسولؐ کے طرز عمل کا جس نے تمام معترضین کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا:۔

سین بلال شین عند الله

بلال کی ''س'' خدا کے یہاں ''ش'' ہے۔

روح خلوص بڑھنے کے بعد عمل کی ظاہری بدصورتی کو بھی چھپا دیتی ہے، کوئی باکمال آپ کے پاس آئے اس کا کمال آپ کو اس کی تعظیم پر مجبور کرے گا چاہے صورت کریہہ بھی کیوں نہ ہو جیسے ایک انسان کا ظاہری جسم اور اس میں اس کی روح، اگر روح صاحب کمال ہے تو اس ظاہری جسم کی صورت چھپ جائے گی، ویسے ہی عمل کی ظاہری شکل اور اس میں روح خالص، اگر روح خالص اور درست ہے تو عمل کو بھی اس شخص کے درست کر دے گی، بیشک کوتاہی اگر انسان کی اختیاری ہو تو قابل الزام ہے اور اگر قدرت کی طرف سے بنایا ہی ایسا گیا تو مورد الزام بالکل نہیں اس طرح سے حبش کے رہنے والے کو عزت دی گئی، ملک فارس کے رہنے والے یعنی سلمان، کیا کہنا اس عزت کا، قریب کے بیٹھنے والے غیر ہو گئے اور دور دراز ملک کا رہنے والا عزیزوں سے بڑھ گیا، وہ کیا چیز تھی؟ وہ قوت عمل تھی ایک آدمی دس دس گز خندق کھود رہا تھا مگر وہ سلمان ہی تھے جو دس آدمیوں کے برابر کام کر رہے تھے ہر جماعت کی خواہش ہوئی کہ سلمان کو اپنے میں داخل کر لیں، مگر جب رسولؐ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا تو فرمایا کہ ''سلمان نہ تم میں سے اور نہ تم میں سے

بلکہ سلمان ہم میں سے ہیں"

مال ودولت واستغنائے ظاہری کی بنا پر جو امتیاز قائم کرلیا گیا اس کو اسلام کی جانب سے یہ کہہ کر غلط قرار دیا گیا کہ:۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔

بس ایک خدا کی ذات ہے جو غنی ہے اور تم سب فقیر ہو۔

اب ایک دوسرے پر فخر کرنے کا حق نہیں رہا مال ودولت کا زیادہ ہونا، انسان کے لئے استغنا کی دلیل نہیں ہے بلکہ فقر کی دلیل ہے جس قدر مال ودولت زیادہ ہوگی اتنے ہی ضروریات زیادہ ہوں گی جتنے ضروریات زیادہ ہوں گے اتنی ہی احتیاج زیادہ ہوگی۔ سچ بتایئے! وہ زیادہ غنی ہے جو کم افراد کا محتاج ہو یا وہ جو زیادہ افراد کا محتاج ہو، درحقیقت غنی تو وہ ہے جو کسی کا بھی محتاج نہ ہو، اب آپ اگر غور کیجئے تو غنی تو کوئی فرد بل ہی نہیں سکتی لہٰذا مدارج احتیاج مختلف ہوئے، ایک فقیر اور محتاج جو اپنے

ہاتھ سے زراعت کرتا ہے وہ بہت زیادہ غنی ہے بہ نسبت اس بادشاہ تاجور کے جو اپنی زندگی کا ایک لمحہ نہیں گذار سکتا جب تک ہزاروں آدمی اس کے انتظام ملک، انتظام خانہ داری کے اسباب مہیا نہ کریں جتنا جتنا دنیا میں تفوق بڑھتا جائے گا اتنی ہی احتیاج زیادہ ہوتی جائے گی مال ودولت کو "حطام" کی لفظ سے تعبیر کیا مال ودولت کو یہ کہا کہ ہاتھ کا میل ہے پھر ایک انسان اگر اپنے جسم پر زیادہ ہونے سے فخر کر سکے، تو اس مال ودولت پر فخر کرنا بھی زیب ہے اس طرح مال ودولت کے امتیاز کو مٹایا، بے شک مال ودولت کو اگر کوئی شخص ذریعہ قرار دے اسباب خیر کا، امور خیر کے انصرام کا تو یقیناً یہ مال ودولت سبب نجات اخروی بن سکتا ہے۔ لیکن اس وقت مال ودولت سبب امتیاز نہیں ہے بلکہ وہ عمل سبب امتیاز ہے مال ودولت ذمہ داریوں کو بڑھاتا ہے انسان کو زیادہ پابند بناتا ہے انسان کو زیادہ خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بہت سے معاصی ہیں جو انسان سے محض دولت مندی کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں اگر وہ سبک بار ہوتا تو شاید وہ ان معاصی میں مبتلا نہ ہوتا اس کے بعد حکومت وسلطنت وہ تو مال ودولت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ مگر اس کو یہ کہا کہ "اَلْمُلْكُ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ" اگر سلطنت اپنی ہوتی تو اس پر فخر بھی کیا جاتا لیکن غیر کی دی ہوئی چیز!

ایک عاریتی چیز! اس پر فخر کیسا؟ اس پر اعتماد اور بھروسا کیسا؟ کتنے سر تھے جو صبح کو تاج شاہی رکھتے تھے شام کو ٹھوکریں کھاتے ہوئے دکھائی دیے، کتنے آدمی کل تک چتر چاہی جن کے سروں پر تھے دوسرے دن قبر بھی نصیب نہ ہوئی اس پر فخر کیسا؟ نام ونسب۔ اس امتیاز کو قدرت نے غلط ثابت کیا۔

آپ کے سامنے نوحؑ کا قصہ پیش کیا، طوفان کی اٹھتی ہوئی موجیں اس میں ایک کشتی، اس پر حضرت نوحؑ اور ان کے تمام اہل بیت، ان کا بیٹا پانی میں غرق ہو رہا تھا، نوحؑ آواز دیتے ہیں ''میرے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا'' ''يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ'' اس واقعہ کا تذکرہ مدنظر نہیں بیٹے نے سماعت نہیں کی، موجوں نے ڈھانپ لینا چاہا، نوحؑ متوجہ ہو گئے خدا کی طرف اس کے ایک وعدہ کا واسطہ دینے لگے ''اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ'' میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے۔ وعدہ یہ ہوا تھا کہ تمہارے اہل غرق سے محفوظ رہیں گے، قدرت کی طرف سے جواب مل گیا ''اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ، اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ'' یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے یہ تو عمل غیر صالح ہے۔ اس طرح فرزندی کے رشتہ کو جو کسی نبی کی طرف استناد رکھتا ہو بے اعتنا ثابت کیا، مگر جیسا کہ بیان ہوا غیر اس عمل کی وجہ سے اپنا ہو گیا سلمان اہل بیت میں داخل ہو گئے۔

یہ عمل وہ چیز ہے جو مجتمع اجزاء کو منتشر کرتا ہے اور منتشر عناصر کو بہم بناتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے اور اس طرح اس نے عملی طاقت کو نوع انسانی کے بلند کیا، کہ دنیا کسی چیز کو سبب امتیاز نہ سمجھے جو کچھ سبب امتیاز قرار دیا جائے وہ عمل صالح ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

قرآن مجید میں خطاب ہے رسالت مآبؐ سے، دوسروں کو تعلیم دینا مدنظر ہوتا ہے تو کسی خاص شخص سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے، رسولؐ کی شخصیت سے بڑھ کر اور کسی کی شخصیت دنیا میں نہیں ہو سکتی اسلام کے نقطۂ نظر سے مگر شخصی خصوصیت کو معیار عمل کے سامنے بے اعتبار ثابت کرنے کے لئے ارشاد ہوا!۔

''لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ''

اللہ اکبر! خدائے ملک وملکوت کا جاہ وجلال ہے کہ رسول کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے یقیناً رسولؐ کو اس کی ضرورت نہ تھی، مگر ہم کو سنانے کی ضرورت تھی، کہا جا رہا ہے ''اگر تم شرک کرو تو

تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تم روز قیامت نقصان اٹھانے والوں میں محسوب ہو۔

ارشاد ہو رہا ہے یہ دکھانے کے لئے کہ خصوصیت شخصی کوئی چیز نہیں ہے جو کچھ ہے وہ عمل ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا:۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ.

اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگو باوجود اس علم کے جو تم کو حاصل ہو گیا ہے تو کیا ہوگا؟ تمہارا شمار ظالمیں میں ہو جائے گا۔

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ.

اگر تم ان کی پیروی کرو اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم آچکا تو یاد رکھو، پھر ہم تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔

اس طرح یہ ظاہر کیا کہ رسولؐ کی بھی شخصیت کے ہم جانبدار نہیں ہے ہم کو تو رسول کا عمل محبوب ہے، رسولؐ کے ذاتی کمالات محبوب ہیں، رسولؐ کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بے شک رسولؐ کی طرف ان باتوں کی نسبت دینا ویسا ہی تھا جیسے یہ کہا کہ:۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا.

اگر زمین میں دو خدا ہوتے تو فساد ہوتا۔

حقیقتاً فرض محال کے طور پر کہا گیا ہے لیکن نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ در حقیقت عمل ہی وہ چیز ہے جو معیار موالات ہے، معیار محبت الٰہی ہے۔ اس خطاب کو رسولؐ اپنے عزیز داروں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں:۔

يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ إِنِّي لَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا

سنو اے میرے خاص رشتہ دارو اور عزیزو! میں خدا کے مقابلہ میں تمہاری کوئی جانب داری نہیں کر سکتا۔ خدا کی تائید تمہارے لئے بہر حال ضروری ہے۔

ایک مقام پر جہاں ازواج رسولؐ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ وہاں یہ کہا ہے کہ صرف انتساب کی وجہ سے تمہاری ذمہ داری زیادہ ہے، انتساب کی وجہ سے مقام عمل میں تمہیں پابندی زیادہ کرنی چاہیے:۔

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ

تم اور عورتوں کے مثل نہیں ہو۔

اور عورتیں اگر کسی حکم کے خلاف کریں تب بھی وہ اتنا قابل گرفت نہیں جتنا تمہارا مخالفت کرنا تم کو امتیاز خصوصی حاصل ہے لہذا تم کو ان احکام کا بیشتر پابند ہونا چاہیے۔

اس کے بعد یہ ارشاد ہے:۔

مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

اگر تم میں سے کسی نے کوئی گناہ کیا تو میں اس کی سزا دونا کردوں گا۔

اس طرح انتساب کی دشواری کو بتلایا، اس کے معنی یہ ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ عمل کی جانچ سختی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ امیر المومنینؑ نے ایک خط میں جو ابن عباسؓ کو تحریر فرمایا ہے یا کسی اور عزیز کو، بہت سے اہل سیر نے ابن عباسؓ تحریر کیا ہے کسی حضرت کے عزیز نے یہ صورت اختیار کی تھی (حب دنیا اس سے غیر معصوم کا مستثنیٰ ہونا کب ضروری ہے) وہ آپ کی طرف سے گورنر تھے بصرہ کے، اور خزانہ بیت المال کے اموال کو منتقل کردیا اپنے گھر کی طرف، اس موقعہ پر امیر المومنینؑ نے خط تحریر فرمایا، وہ خط بہت طویل الذیل ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:۔

وَ اللهِ لَوْ اَنَّ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ فَعَلَا مِثْلَ الَّذِي فَعَلْتَ مَا كَانَتْ لَهُمَا عِنْدِي هَوَادَةٌ وَلَا ظَفِرَا مِنِّي بِاِرَادَةٍ حَتّٰى آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُمَا.

خدا کی قسم اگر حسنؑ وحسینؑ سے یہ طرز عمل صادر ہوتا جو تم سے ہوا تو یاد رکھو کہ میں ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتا اور ان سے حق کو حاصل ضرور کرتا۔

اس طرح سے ہر قسم کے انتساب کو عمل کے مقابلہ میں بے کار ثابت ہوگیا۔ عمل قابل فخر ہے بے شک اگر اس کے ساتھ انتساب بھی ہو تو وہ انتساب عمل کے ساتھ مل کر ایک شرف کا باعث ہے لیکن یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز جس میں شرف زیادہ ہو اس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہوجاتی

ہے یعنی جاہل سے بڑھ کر عالم کی ذمہ داری ہے، عالم سے زیادہ انبیاء کی سے قابل اعتراض ہیں، شرف کے بڑھنے سے ذمہ داری بڑھتی ہے اور اگر اس ذمہ داری کے پورا کرنے کے ساتھ شرف بھی ہو تو کیا کہنا! لیکن اگر شرف کے ساتھ ذمہ داری مفقود ہوگئی تو وہ پھر شرف انسان کے لئے عار وننگ ہوگا اسی صورت سے انتساب کسی ایسی ہستی کی طرف جو صاحب شرف ہے قابل فخر ہے لیکن اسی وقت جبکہ عار وننگ کا دھبہ دامن پر نہ آیا ہو۔

وہ چیزیں جن کو اسلام نے طرہ امتیاز قرار دیا ہے جیسے علم، عمل، نبوت، امامت، رسالت، ان چیزوں کو بجائے خود قدرت نے سربلندی عطا کی ہے۔ بیشک ان کی طرف انتساب قابل شرف ہوگا لیکن ذمہ داری کے ساتھ ساتھ یعنی سید اپنی سیادت پر گھمنڈ نہ کرلیں کہ ہم سید ہیں بلکہ اس کے ساتھ عمل کی ذمہ داری کا زیادہ احساس کریں، اگر کسی غیر سید سے لغزش ہو تو وہ اتنا قابل اعتراض نہیں ہے جس قدر سید سے لغزش ہونا۔ یہ ایک طرف تو معصیت الٰہی ہے دوسری طرف اس رشتہ کی توہین ہے جو رسولؐ کے ساتھ ہے رسولؐ کے ساتھ انتساب رکھنے والا اگر معصیت کا مرتکب ہو تو اس سے معصیت کا وزن بڑھ جاتا ہے جس طرح ایک گناہ کو آپ اپنے گھر میں کیجئے، اور اسی کو مسجد میں کیجئے تو اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اسی طرح سے یہ معصیت جو ایک رسول کے منتسب کی طرف سے ہو ایک طرف گناہ ہے اور دوسری طرف رسولؐ کی توہین ہے۔

عمل اور محبت

کسی قسم کا انتساب عمل کے مقابلہ میں قابل فخر نہیں سمجھا جائے گا، یہ انتساب وہ ہیں جو ظاہری حیثیت سے انتہائی قوت رکھتے ہیں یعنی کسی کی اولاد ہونا، اس کے بعد کسی کا عزیز دار ہونا، اس کے بعد ہے کسی کا دوست ہونا، پہلا درجہ ہے اولاد کا، اس کے بعد عزیزوں کا پھر دوستوں کا، مقام انتساب میں جب وہ انتساب جو فرزندی کا تھا نظر اعتبار سے گرا دیا گیا عمل کے مقابلہ میں اور وہ انتساب جو عزیز داری کا تھا، وہ بے اعتبار ہو گیا عمل کے مقابلہ میں تو وہ انتساب جو ادعائے دوستی کی بناء پر ہو وہ عمل کے مقابلہ میں کیا وزن رکھتا ہوگا۔ رسولؐ کی زبانی جس وقت خطاب ہوا اور معیار محبت بتلایا گیا تو ارشاد ہوا:۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.

اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع یعنی عملی اطاعت کرو، خدا بھی تم کو دوست رکھے گا، محبت کا معیار اتباع کو قرار دیا گیا، قاعدہ وقانون محبت بھی یہی ہے، محبت کے سچے اور جھوٹے ہونے کی تفریق، اطاعت اور اتباع سے ظاہر ہوتی ہے کوئی شخص آپ کی دوستی کا دم بھرنے والا ہے تو آپ اس کی محبت کو کس طرح جانچتے ہیں؟ اس کا محبت کا معیار یہ ہے قانون عقل وفطرت میں کہ عمل سے جانچئے، کوئی حکم دیا جائے۔ اگر اس پر عمل پیرا ہو تو معلوم ہوگا کہ آپ کا دوست ہے اور کوئی عذر کرے تو سمجھ لیجئے گا کہ یہ محبت نہیں جتنی زیادہ خصوصیت کا آپ سے دعویدار ہے اتنا ہی زیادہ سخت فرائض سپرد کئے جائیں گے، در حقیقت محبت کا دعویٰ اتباع کے ساتھ سند قبول حاصل کرتا ہے، تمام دنیا اس طرز عمل پر متفق ہے یعنی ہر قسم کی محبت کا معیار یہی قرار دیا گیا ہے کہ ”کہنے پر زیادہ چلے“ اگر کہنے پر نہیں چلتا تو آپ کہیں گے کہ دوست نہیں جس کی محبت کرتا ہے اس کے کہنے پر بھی چلتا ہے اطاعت بھی کرتا ہے، آپ جائزہ لے لیجئے، میری پرواز خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی کہ میں خدا کے ساتھ براہ راست محبت کروں، لیکن یہ دیکھئے کہ جو لوگ در حقیقت خدا کے دوست تھے تو کیا خدا نے ان کو اس محبت کے بعد مطلق انسان چھوڑ دیا تھا؟ احکام واوامر سے مستثنیٰ کر دیا تھا؟ یا حکم اور بھی زیادہ سخت کر دیئے تھے۔

انبیاء ومرسلین بے شک براہ راست خدا کی محبت کے دعویدار تھے دیکھئے خدا کی محبت کا دعویٰ جو وہ کرتے تھے تو خدا نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ خدا کی طرف سے اس محبت کو معیار امتحان پر جانچا گیا، خود سمجھنے کے لئے نہیں تھا بلکہ دنیا کے سامنے ظاہر کرنا تھا، اس نے عمل سے امتحان لیا، آپ واقعات سنا کرتے ہیں لیکن نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آخر ابراہیمؑ کو حکم دے دیا گیا، ذبح اسماعیلؑ کا، یہ محبت کو عمل کے اعتبار پر کسا تھا اس کے بعد اگر عمل معیار امتحان پر کامل ثابت ہوا تو بیشک پھر محبت کی سند بھی مل گئی۔ یہ کیا تھا کہ ابراہیمؑ کو حکم دے دیا کہ نمرود کے دربار میں جا کر تبلیغ کرو، حالانکہ معلوم تھا کہ آگ میں پھینکے جائیں گے، یہ صرف اس لئے تھا کہ عمل کے مقام میں کنارہ کشی تو نہیں کرتے، جب عمل کیا تب معلوم ہوا کہ خدا کی محبت کا دعویٰ سچا تھا، خلیل کا لقب بھی مل گیا عالم کائنات کی معزز ترین ہستی یعنی رسالت مآبؐ ان سے بڑھ کر تقرب الٰہی کسی کو حاصل

نہیں ہے، آپ دیکھئے اس حبیب کے لقب کا نتیجہ کیا ہے کیا صرف زبانی دعوے سے محبت قابل تسلیم ہوگئی آپ یاد رکھئے جتنے فرائض ہمارے ہیں ان سے زیادہ ان کے اوپر عائد کئے گئے تھے، نماز شب اگر ہم ترک کر دیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن ان کے لئے نماز شب واجب تھی جتنے احکام فرض تھے دوسروں پر ان پر سب سے بڑھ کر عمل کیا اس کے علاوہ بھی کچھ احکام ان کے ذمہ واجب الادا تھے جو ہمارے لئے نہیں ہیں تو در حقیقت محبت معیار حقیقت پر اس وقت کامل اترتی ہے جب اتباع اس کا ثبوت دے رہا ہو، ورنہ وہ دعویٰ محبت انسان کے لئے سبب ایذ انفس ہوگا، وہ دعوائے محبت کہ جس کے ساتھ اتباع نہ ہو۔ انسان کے لئے ان لوگوں کی خوشنودی اور رضا کا باعث نہ ہوگا جن کے ساتھ دعوائے محبت ہورہا ہو، میں نے سال گذشتہ تفصیل سے عرض کیا تھا کہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ محبت کرے اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے۔ اسلام کی جانب سے محبت اہلبیتؑ کی صرف اس لئے تھی کہ ان کے طریق عمل پر چلنا آسان ہوجائے، فطرت کا تقاضا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ محبت ہوگی تو وہ اس کے ساتھ چلے گا، اگر محبت زیادہ ہوگی تو چلنا آسان ہوجائے گا، محبت کے دعوے کو ائمہ معصومین نے بھی اطاعت ہی کے معیار پر جانچا، امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں سہل خراسانی حاضر ہوئے، انہوں نے کہا آپ اپنے حقوق کے طلب کرنے کے لئے تلوار کیوں نہیں اٹھاتے۔ حضرت نے فرمایا: ''اعوان وانصار کہاں ہیں'' سہل نے کہا: ''حضور کے قدموں پر جان نثار کرنے والے دنیا میں بہت ہیں، اس وقت ایران میں ہزاروں تلواریں ہیں جو آپ کے اشارہ پر کھینچ سکتی ہیں وہ سب آپ کے دوست ہیں''۔ یہ سن کر حضرت نے ذرا دیر خاموشی اختیار فرمائی پھر خادم کو بلا کر حکم دیا کہ تنور میں آگ روشن کردو آگ روشن ہوگئی، آپ سہل کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: ''سہل اس تنور میں داخل ہوجاؤ''۔ ان کے جسم میں لرزہ پڑ گیا، معافی طلب کی۔ حضرت نے سکوت کیا۔ ''تھوڑی دیر میں ادھر سے ہارون مکی داخل ہوئے۔ ابھی نعلین ہاتھ میں تھی، جواب سلام کے بعد سب سے پہلے حضرت نے ان سے یہی فرمایا کہ ''اے ہارون مکی! اس تنور میں داخل تو ہوجاؤ''۔ انہوں نے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ واقعہ کیا ہے۔ فوراً تنور کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت کی کسوٹی ہے حکم کا اتباع، امام جعفر صادق (علیہ السلام) فرماتے ہیں، اپنے اصحاب کو مخاطب کرکے

مَنْ اَطَاعَ اللّٰہَ فَھُوَ لَنَا وَلِیٌّ وَمَنْ عَصَی اللّٰہَ فَھُوَ لَنَا عَدُوٌّ۔

جو شخص خدا کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست ہے اور جو خدا کی معصیت کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر انتساب کے ساتھ معصیت ہو تو معصیت کا وزن بڑھ جاتا ہے اس لئے کہ ایک طرف تو معصیت ہے اور دوسری طرف توہین ہے۔ اس لئے فرمایا:۔

کُوْنُوْا لَنَا زَیْناً وَلَا تَکُوْنُوْا عَلَیْنَا شَیْناً۔

تم ہمارا شیعہ اپنے تئیں کہتے ہو تو اپنے طرز عمل سے ہمارے لئے سبب نازش بنو، ہمارے لئے سبب عار و ننگ نہ بنو۔

اگر ہم اپنے تئیں ان حضرات کی طرف منسوب کریں اور عمل میں کوئی پابندی نہ کریں تو ہم نے اہانت کی اس انتساب کی، اس کے ساتھ توہین ہے ان افراد کی جن کی طرف وہ انتساب ہو رہا ہے۔ پھر جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے انہی فرائض کے قائم کرنے کے لئے اپنی جانیں دے دیں، انہوں نے اسی پابندی شریعت کے رواج دینے کے لئے اپنے تئیں ظاہری حیثیت سے فنا کر دیا، نماز کی اہمیت اس حد پر کہ امیر المومنینؑ کا مصلیٰ جنگ صفین میں دونوں لشکروں کے درمیان بچھا دیا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ عرض کرتے ہیں کہ ہم تو جنگ کرتے ہیں، یہ نماز کا موقع ہے؟ فرماتے ہیں" اسی نماز کے لئے تو جنگ ہو رہی ہے" امام زین العابدین (علیہ السلام) کے احتضار کا عالم، وفات کے پہلے تمام اعزا اور احباب کو جمع کیا آخری بات جو زبان سے نکلی وہ تین مرتبہ "الصلوۃ، الصلوۃ، الصلوۃ" اس کے بعد زبان بند ہو جاتی ہے، کوئی مرنے والا مرتا ہے تو اعزا اور احباب کو فکر ہوتی ہے کہ آخری وصیت کیا کی، اس کو حتی الامکان پورا کرتے ہیں۔

ہم محبت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں قائم کرنے کے لئے انہوں نے اپنی جانیں دیں، گھر بار لٹا دیا، جس کے قائم کرنے کے لئے مرتے مرتے وصیتیں کیں ان چیزوں کو ہم اپنے اعمال سے پامال کریں۔ ہم ان کی محبت کو بہانہ قرار دیں ان احکام کے مٹانے کا، یہ تو درحقیقت ہماری دوستی نہ ہوگی، ہم سنا کرتے ہیں واقعات کربلا، ان سے سبق کیوں نہیں لیتے، کیا وہ بے قدر چیز تھی جس کے لئے آخری شب، ایک شب کی مہلت لی گئی، جبکہ دشمن کی صفیں حملہ آور ہوں

اس وقت یہ کہا جائے کہ ہم کو نماز کی مہلت دے دو۔ اور پھر معلوم بھی تھا کہ اس پر جواب کتنا سخت ملے گا، یہ کیا تھا؟ عبادت خدا کی اہمیت تھی جس کا ایسے ایسے اوقات میں خیال رکھا، انہی چیزوں کو ہم چھوڑ دیں اور محبت کا دعویٰ بھی کریں یہ ہمارے لئے سبب نازش نہیں ہے بلکہ سبب وبال ہوگا، آپ نے سنا ہوگا کہ آپ کے نامہ اعمال حضرت حجتؑ کے سامنے پیش ہوا کرتے ہیں۔ حضرت اس پر نظر فرماتے ہیں اگر اچھے عمل نظر آئے تو چہرہ پر بالیدگی ظاہر ہوتی ہے اگر برے عمل پیش ہوتے ہیں تو آنسو نکل آتے ہیں، ہم اپنے امامؑ کے گریہ وبکا کے باعث ہوں اور پھر دوست سمجھے جائیں ،در حقیقت اسلام کے تعلیمات قوت عمل کو ترقی دینے والے ہیں۔ اسلام نے محبت کا آپ کو حکم دیا تو وہ حقیقتاً عمل کی اصلاح کا حکم تھا، اس لئے کہ ایسے افراد جو سرتاپا مجموعہ کمالات ہیں جو سر سے پاوں تک نمونہ ہیں تعلیمات اسلام کے فطری قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے لباس کو بھی دوست رکھتا ہے اس کے افعال کو بھی دوست رکھتا ہے" الناس علیٰ دین ملوکھم "سلطنت کے اقتدار کی وجہ سے بادشاہ کا اثر دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنیت تبدیل ہو جاتی ہے یہ وہ اثر ہے جو جبری سلطنت کے شکوہ سے دل پر پڑتا ہے، لیکن اگر کسی کا حقیقی اثر دل پر قائم ہو جائے تو ناممکن ہے کہ انسان اس کے اخلاق وعادات سے نفرت کرے اور بیزار ہو، در حقیقت ظاہر باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے کہ تمام اعضاء وجوارح تابع دل ہیں، اگر دل کسی طرف مائل ہو گیا تو پھر ناممکن ہے کہ اعضاء وجوارح سرتابی کر جائیں، یہ وہ سلطنت نہیں ہے جس میں کبھی بغاوت ہوتی ہو۔ سب دل کے مطیع ہیں یہ کبھی مخالفت نہیں کرتے اگر دل پر کسی کا سکہ قائم ہو جائے تو اعضاء وجوارح بھی متاثر ہوں گے۔

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔

جو شخص کسی قوم سے شباہت اختیار کرے انہی کے ساتھ محسوب ہوگا۔

یہ شباہت دلیل ہے اسبات کی کہ اس کا میلان اسی طرف ہے یہ اسلام کی تاکید کہ اہل بیت کے ساتھ محبت کرو اسی لئے تھی کہ محبت کے ذریعہ سے دل پر سکہ قائم ہو جائے، پھر تمام اعضاء وجوارح خود ہی دل کے راستے پر چلیں گے، در حقیقت محبت کا حکم تمہید عمل تھا، یہ نہ سمجھئے کہ میں محبت کی اہمیت کم کر رہا ہوں سال گذشتہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ محبت کا حکم انسان کی عملی اصلاح کے

لئے ہے،خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو انہی راستوں پر صرف کرنا یہ شکر الٰہی ہے اس کا ذریعہ ہے معرفت باری تعالیٰ اس لئے درحقیقت معرفت باری تعالیٰ بھی عملی اصلاح کے لئے ہے اس معرفت باری ہی کی دوسری مثال محبت رسولؐ واہل بیتؑ رسولؐ کو سمجھ لیجئے، رسالت مآبؐ اور ان کے اہل بیت اطہار کی محبت درحقیقت ایک کامیاب ذریعہ ہے ان کے طریق عمل پر چلنے کا۔

ہم نے کیا اصلاح عمل کی کوشش کی؟ یہ ہماری غلط ذہنیت ہے ہم اس عہد سے بعید ہو گئے جب ہدایات کی بارش ہو رہی تھی، دور ہوتے ہوتے ہمارے ذہنیتوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں، دنیا سہولت کو پسند کرتی ہے جس میں زیادہ ظاہری آسانی ہوئی وہی طبائع کے اندر راسخ ہو گیا، بس زبان سے کہہ دیا کہ ہم محب ہیں، میں نے سابق میں اشارتاً بیان کیا کہ نصاریٰ نے اسی طرح سے قوت عمل کو سلب کیا کہ کہا کہ مسیح جو دنیا سے اٹھے تو سب گناہوں کی ذمہ داری لیتے گئے، ان کے سولی پر چڑھ جانے نے ہم کو آزاد کر دیا اب ہم پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے اسلام نے اس کو باطل قرار دیا:۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔

کوئی ایک دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔

اس سے عیسائیت کی جو تعلیم تھی اس کو غلط ثابت کیا لیکن کیا یہ افسوسناک بات نہ ہوگی کہ بعض لوگوں کے ذہن میں ہم میں سے یہ خیال قائم ہو جائے کہ درحقیقت حضرت سید الشہداؑ اسی معنی میں نجات دہندہ ہیں جن معنوں میں عیسائی مسیح کو نجات دہندہ خیال کرتے تھے، ہم نے ذاکروں کی زبانی سن لیا کہ حضرت نے گناہگاروں کے لئے شہادت اختیار کی، لہٰذا اب جو چاہیں کریں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو گناہ کی ترقی کا ذریعہ قرار دے لیا جس چیز کے قائم کرنے کے لئے انہوں نے جان دی ہم نے اپنی غلط ذہنیت کے ذریعہ سے ان کی شہادت کو اس کے پامال کرنے کا باعث قرار دے لیا ہم نے امام حسین علیہ السلام کو اپنے معاصی کے حق بجانب ثابت کرنے کا بہانہ قرار دیا ہم نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اس بات کو سمجھنے کی کہ حسینؑ کس طرح سے نجات دہندہ ہیں امت کے، انہوں نے بیشک ہماری نجات کے سامان مہیا کرنے کے لئے اپنی جان دی لیکن ہم نے کبھی اس کے معنی سمجھنے کی کوشش نہیں کی اگر آپ

حالات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیائے اسلام سے اسلام کی حقیقی صورت رخصت ہو چکی تھی۔ دنیا میں معصیت کی تاریکی تھی، اطاعت الٰہی ایک فراموش شدہ چیز ثابت ہو چکی تھی، دنیا بادشاہوں کے راستوں پر چل رہی تھی، پھر جبکہ وہ بادشاہ خلافت اسلامیہ کا لباس بھی پہن چکے ہوں، مذہبی تخت پر بیٹھنے والا ہر قسم کے فسق وفجور کا مرتکب ہو رہا ہو، بقول ابن حجر کی قریبی رشتہ داروں یعنی ماں اور بہنوں کو نہ چھوڑا جاتا ہو، غسیل الملائکہ کی زبانی وہ کہتے تھے "ہم نے اس وقت خروج کیا جب ہم کو خوف ہو گیا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے"۔

"انہ کان رجلا ینکح الاخوات وامہات واولاد"

جس وقت دنیا کی ذہنیت تبدیل ہو گئی، اور اسلام کے خط وخال مٹ چکے تھے، جس وقت ذمہ دار اشخاص اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، جس وقت کوئی اعتراض کی جرات نہیں کرتا تھا، اس وقت اگر رسول کا فرزند اگر اسلام کا ایک ذمہ دار رہنما یعنی حسینؑ بن علیؑ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تو یاد رکھو کہ دنیا میں پھر اسلام کی تصویر نہ دکھائی دیتی، دنیا میں پھر اسلام کے احکام کا نام لیوا دکھائی نہ دیتا اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ امت مرحومہ جو رسولؐ کے قول کے مطابق نجات کی مستحق تھی وہ جا رہی تھی ہلاکت ابدی کے راستے پر لیکن حسینؑ نے اپنی جان دے کر حقانیت کو ظاہر کیا اور دنیا کو بتایا کہ سلطنت اور ہے اور طاعت باری اور ہے۔ دنیا کچھ اور ہے دین کچھ اور ہے، حق اور ہے باطل اور ہے، دنیا کی آنکھیں کھول دیں، دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیے، اس طرح اسلام حسینؑ کی بدولت قائم رہا، حسینؑ ہماری نجات کے باعث ہوئے، امت رسولؐ کی نجات کے باعث ہوئے لیکن اس کے کیا معنی؟

اس کے معنی ہیں کہ حسینؑ نے نجات کا راستہ نمایاں کر دیا، نجات کا ذریعہ بتا دیا، نجات کی صورت نمایاں کر دی، اس طرح حسینؑ نجات دہندہ امت ہیں۔ یعنی حسینؑ نے ایک امت کی تشکیل کی جو اپنے عمل سے نجات کی مستحق ثابت ہو اور اس لئے درحقیقت ہم نے حسینؑ کے وجود کو نشاۃ ثانیہ اسلام کا باعث سمجھتے ہیں یعنی اگر رسولؐ نے اسلام کو قائم کیا، تو حسینؑ نے اسلام کو دوسر وجود دیا، حسینؑ نجات دہندہ ہیں یعنی اگر حسینؑ نہ ہوتے اور ان کا طرز عمل نہ ہوتا تو ہم نجات کے مستحق نہ ہوتے یعنی ہم وہ عمل ہی نہ کرتے جو سبب نجات قرار پا سکیں۔ ہم اسی راستے پر ہی نہ چلتے

جو نجات کا باعث ہوسکتا ہے، حسینؑ نے اپنے طرز عمل سے ہم کو نجات کا مستحق بنا دیا ہمیں ایسے طریقوں پر کاربند بنا دیا کہ ہم اپنے عمل سے نجات کے مستحق ہوئے اس طرح سے حسین نجات دہندہ ہیں۔ اس طرح نہیں جس طرح عیسائیوں کے مسیح نے گناہوں کا راستہ کھول دیا ہمارا مظلوم شہید تو اطاعت کے راستے پر لے جانے والا تھا، گناہوں کا دروازہ کھولنے والا نہیں تھا۔

ان معنوں میں حسینؑ نجات دہندہ تھے، حسینؑ نے ہمارے قوائے عملی کو معطل نہیں کیا، در حقیقت گریہ وبکا کا حکم دیا گیا ہے اس کے بہتر سے بہتر ثواب مقرر کئے گئے ہیں اگر گریہ وبکا کا ثواب ہمارے سامنے ہوگا تو ہم ان کے حالات کو زیادہ پیش نظر رکھنے پر آمادہ ہوں گے اس کا یہ اثر ہوگا کہ ہمارے اعمال پر ان کا اثر پڑے، ورنہ یاد رکھئے اگر اتنی اہمیت اس واقعہ کو بحیثیت مصیبت نہ دی گئی ہوتی تو دنیا کے تمام واقعات کی طرح یہ بھی تاریخی کتابوں کے سپرد ہو جاتا اور یہ جو ہمارا بچہ بچہ اس واقعہ سے واقف ہے یہ کبھی نہ ہوتا، آج ہم اس سے واقف ہی نہ ہوتے تو سبق کیا حاصل کرتے۔

لیکن یہ دعوت مصیبت سے اثر لینے کی طرف وگریہ کی طرف یہ تو مقتضائے فطرت ہے اس کو خاص طور سے قائم کرنے کی دعوت اس لئے تھی کہ واقعات بھولنے نہ پائیں تاکہ اس واقعہ کے اصلی مفاد جو ہیں وہ محفوظ رہیں۔ اس واقعہ کا اصلی مقصد جو ہے وہ قائم رہے، اور عملی ترقی زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتی رہے، چھوٹے چھوٹے جزئی واقعات جن کا واقعہ کربلا ایک مجموعہ ہے وہ حقیقی تعلیم اسلام ہے یعنی ہر عمل میں کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے تعلیم کا، واقعہ کربلا باوجود اپنی مختصر مدت کے باوجود اپنے محدود وقت کے تمام اہم تعلیمات اسلام کا مرکز تھا ہر قسم کی علمی تعلیم، حق اللہ سے متعلق، حق الناس سے متعلق، تربیت منزل سے متعلق معیار ملک وسلطنت سے متعلق، تمدن سے متعلق، اجتماعی وانفرادی زندگی سے متعلق، شرائط محبت سے متعلق، تمام اخلاقی، علمی عملی تعلیمات سب کے سب واقعہ کربلا میں مضمر ہیں۔ اس لئے اس واقعہ کو چھوٹے چھوٹے جزئیات بھی وہ اہمیت رکھتے تھے جن کو ہم تک پہنچانا ضروری تھا، در حقیقت اسلامی نقطہ نظر سے (اور میں اپنے عقیدہ کی بنا پر بھی کہتا ہوں کہ ہم امام حسین کو صرف اس بنا پر دوست نہیں رکھتے اور مستحق تعظیم نہیں سمجھتے کہ وہ رسولؐ کے نواسے تھے، رسالت مآبؐ نے بھی کبھی ان افراد کو صرف اس وجہ سے

دوست نہیں رکھا کہ وہ آپ سے نسبت اور رشتہ داری رکھتے تھے یہ کہنا درحقیقت رسولؐ کی روحانی شخصیت پر الزام لگانا ہے، اگر ہم یہ سمجھیں کہ جو کچھ آپ نے اپنے اہل بیتؑ کے ساتھ کیا وہ رشتہ داری کا نتیجہ تھا ہم امیر المومنینؑ کو اس لئے دوست نہیں رکھتے کہ وہ داماد تھے یا چچازاد بھائی تھے ہم حضرت سید عالمؑ کو اس لئے دوست نہیں رکھتے کہ وہ حضرت کی صاحبزادی تھیں درحقیقت رسولؐ نے جو کچھ ان حضرات کا پاس کیا، وہ اس لئے تھا کہ آپ کے اخلاق اور آپ کے کمالات کی یہ افراد سچی تصویر تھے ہم ان افراد کے لئے شرط عقیدت اس لئے ادا کرتے ہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ہمارے مقتدا ہونے کے قابل تھے ہم نے کبھی شرائط امامت میں رشتہ داری کو نہیں رکھا ہے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ افراد معصوم تھے وہ حضرت کی اولاد میں سے تھے یا حضرت کے داماد تھے، لیکن ہم نے شرائط امامت میں یہ نہیں قرار دیا کہ حضرت کا داماد ہو یا اولاد میں سے ہو۔

جتنی اہمیت واقعہ کربلا کو دی گئی وہ نہ صرف اس لئے کہ رسولؐ کی طرف انتساب رکھنے والی ہستیاں تھیں بلکہ درحقیقت اس لئے کہ اسلام کے سچے مجسمے جو تھے ان کو مسلمانوں کی تلواروں نے تہہ تیغ کیا، واقعہ کربلا کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ بھی اس حیثیت سے نہیں ہوئی کہ وہ ایک درد انگیز مصیبت تھی بلکہ اس لئے ہے کہ جس مقصد کے لئے ہوئی تھی اس سے ہم روشناس ہو سکیں بے شک رونے کا حکم دیا گیا اس کا مقصد خود اس حکم میں مضمر ہے گریہ و بکا خاص طور سے رضائے الٰہی کا سبب ہے اور وہ حکم ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن اسلام کا مقصد اس سے جو تھا وہ ہماری عملی اصلاح تھی، ہم نے اس مقصد کو بھلا دیا اور اپنے پیش نظر نہیں رکھا اس میں اسلام کا قصور نہیں ہے۔

اسلام میں عمل کی اہمیت

دنیا اسلام کے خلاف یہ غلط دعویٰ کرنے کی جرأت کرتی ہے کہ اسلام نے دنیا کو عمل کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ انسان کے قوائے عمل کو معطل رکھا ہے لیکن یا تو یہ ان لوگوں کی بے خبری ہے یا واقعی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے۔ جب اسلام کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ملتا تو یہ اعتراض ڈھالا جاتا ہے۔

درحقیقت اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے جس نے عمل کو معیار قرار دیا ہو اگر آپ قرآن کی ورق گردانی کیجئے تو آپ ملاحظہ کیجئے گا کہ جہاں جہاں نجات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں عمل صالح کو داخل کردیا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ.

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کئے ہیں ان کے لئے بہترین بازگشت ہے۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ.

اس کتاب (قرآن مجید) میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے یہ ہدایت ہے اس جماعت کے لئے جو خدا سے ڈرنے والی ہے جو غیب پر ایمان لاتی ہے اور نماز پڑھتی ہے اور زکوۃ ادا کرتی ہے۔

اس میں جہاں ایمان کی طرف اشارہ ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ صلوۃ کا بھی تذکرہ ہے، زکوۃ کا بھی تذکرہ ہے۔ قرآن میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے جہاں عمل کو بلا ضرورت ثابت کیا ہو اور عمل سے کنارہ کشی کی اجازت دی ہو، ہر چیز عمل پر موقوف قرار دی، درحقیقت ایک کلیہ دنیا کے سامنے پیش کیا "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ" بس انسان اپنی کوشش کا رہین منت ہے جتنی کوشش کرے گا وہ کوشش اس کے سامنے آئے گی۔

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ. وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ. ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ. وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ.

انسان کے لئے وہی ہے جو اس نے کوشش کی اور اس کی کارگذاری دیکھی جائے گی پھر اس کو پوری پوری جزا دی جائے گی، آخر میں تو اسے خدا ہی کے سامنے جانا ہے، خدا ہی کے سامنے اسے پیش ہونا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ.

انسان کا نفس جو کچھ وہ حاصل کرے گا وہی اس کے کام آئے گا جو کچھ اپنے ہاتھ سے اپنے لئے وہ کر رکھے گا، وہی اس کے خلاف پیش کیا جائے گا درحقیقت ثواب بھی عمل کا نتیجہ ہے۔

اور عقاب بھی عمل ہی کا نتیجہ ہے، وہ اپنا ہی حاصل کیا ہوا ذخیرہ ہوگا اور اپنا ہی کھودا ہوا کنواں، اپنی

روشنی کی ہوئی آگ ہوگی جو روز قیامت اس کے سامنے پیش ہوگی۔

وہ کوئی چیز نہیں ہے وہ انسان کے عمل ہیں جو بھیس بدل کر سامنے آجاتے ہیں ہیں وہ وہی یہاں کے اعمال ہوں گے جو صورت ثواب وعقاب میں پیش ہوں گے، اچھے عمل کئے، صورت نیک سامنے آئی برے عمل کئے صورت بری حاصل ہوئی۔

اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ.

دنیا کھیتی ہے آخرت کی۔

اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ بیج جو آپ بوتے ہیں درحقیقت اس میں ایک دنیا مضمر ہے اس تمام کاشت کی جو آپ کے سامنے آئے گی اسی طرح عمل صالح ایک تخم زراعت ہے جو زمین اخلاص پر بویا جاتا ہے جس طرح سے دانہ زمین میں بویا اور خاک کے پردہ میں نہاں ہوگیا آپ کو خبر نہیں ہے کہ زمین کے پردوں میں کیا ہو رہا ہے درحقیقت وہ ضائع نہیں ہوگیا، وہ خزانوں میں محفوظ ہے وہ جتنا بویا گیا ہے اس سے زیادہ ہو کر ملے گا، اسی طرح انسان نے عمل کیا اور دامن زمانہ اسے اپنے ساتھ لیتے گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہوگیا مگر زمین نشو ونما دینے والی تھی آپ کا عمل یہاں جو ایک دانہ کی شکل رکھتا تھا وہاں اس میں پھیلاؤ پیدا ہوگیا، کم از کم وہ چند ہوا!۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا.

اور زیادہ سے زیادہ اس کو خدا جانے، ایک حبہ ہو اور اس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں یہ مثال اس عمل کی ہے جس میں افزائش پیدا ہو۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی

اسلام کے معتدل قوانین دنیا نے انسانی زندگی کے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا اس میں مختلف نظریے کارفرما نظر آتے ہیں بعض لوگوں نے انسانی حیثیت کو اسی موجودہ دنیا میں محدود سمجھ کر صرف اسی دنیا کی اچھائی اور خیر و برکت کو پیش نظر رکھا، انہوں نے اپنا نقطہ نظریہ قرار دیا کہ اس دنیا میں رہو سہو راحت و آرام اٹھالو، اس کے بعد کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ بے شک اگر انسان کی زندگی اسی طرح محدود ہے کہ اس کی ابتدا وقت ولادت سے ہوئی ہے اور انتہا دنیا سے رخصت ہونے پر

ہوتی ہے تو ایسا ہی ہونا چاہیے، اس وقت انسان کا مقصد زندگی یہی موجودہ زندگی ہونا چاہیے، اور یہ موجودہ زندگی بہتر سے بہتر طریقہ سے گذاری جائے اسی کو نصب العین ہونا چاہیے، کسی نے آخرت کا خیال اپنے پیش نظر کیا اور اس حد تک کہ موجودہ دنیا کی ضرورت کو بالکل نظر انداز کردیا، انہوں نے موجودہ دنیا کی حیات کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھا بلکہ جو کچھ بھی اہمیت دی وہ صرف آخرت کی زندگی کو یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انسان کے لئے اسے عبادت قرار دیا کہ انسان تمام دنیا سے بددل ہو کر تمام رشتوں کو توڑ کر پہاڑوں پر جا کر تنہائی میں زندگی بسر کرے، سخت ترین تکلیفوں کے ساتھ اپنے نفس کو ایذا پہنچائے اس ایذائے نفسانی کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ سمجھا، آپ دیکھئے گا تو آپ کے ارباب وطن یعنی ہندوں کے بہت سے فرقوں میں اس قسم کی عبادتیں آپ کو ملیں گی جو صرف ایذائے نفسانی پر مبنی ہیں، آپ کو ملیں گے ایسے افراد جو خدا کی خوشنودی کے لئے اپنے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں اور اسی حالت پر باقی رکھتے ہیں، یہاں تک کہ خشک ہوجائیں اس سے وہ خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں، آپ کو ایسے افراد ملیں گے جو آب وغذا ترک کردیتے ہیں اس حد تک کہ بالکل ضروریات زندگی سے بے کار و معطل ہوجائیں اور اس سے وہ صرف خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ میں نے ایک عربی اخبار میں جو مصر سے نکلتا ہے ایک تصویر دیکھی ایک شخص نے ایک تخت میں میخیں گاڑ رکھی ہیں ان پر وہ پاؤں رکھ کر بیٹھا ہوا ہے تاکہ وہ اس کے پیروں میں چبھیں اور خدا کی رضامندی کا باعث ہو۔ ایسے بھی لوگ ملیں گے جو مندروں میں جا کر بچوں کو ذبح کرتے ہیں اور اس سے وہ خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے سبب رضائے خدا قرار دیا گیا ہے کہ مرد کے مرنے کے بعد اپنے تئیں نذر شعلۂ آتش کردیں اور اس طرح خدا کی رضامندی حاصل کریں۔

عیسائیت کی تعلیم اس وقت بھی انجیل کے صفحات پر موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص ملکوت آسمان میں داخل نہیں ہوسکتا جس کی شادی ہوگئی ہو کوئی شخص ملکوت آسمان میں داخل نہیں ہوسکتا جس نے ایک وقت کھایا ہو اور دوسرے وقت کے لئے گھر میں رکھا ہو کہ صبح کھائیں گے ان لوگوں نے درحقیقت عالم کائنات کی تصویر کے ایک ہی رخ پر نظر کی آخرت ہی کو دیکھا اور آخرت ہی کو اپنے پیش نظر رکھا مگر اس موجودہ دنیا کو اس قدر بے حقیقت سمجھ لیا اور اس قدر بے وقعت قرار

دے لیا کہ گویا خدا نے انسان کے لئے موجودہ زندگی جو قرار دیا ہے وہ بالکل عبث اور بیکار ہے اگر موجودہ دور زندگی درحقیقت کوئی قابل اعتبار چیز ہی نہ تھی تو قدرت نے انسان کے لئے یہ دور زندگی قرار ہی کیوں دیا، انسان کے لئے یہ زندگی عطا کیوں کی، خدا کی ہر نعمت اس وقت تک جب تک کہ وہ نعمت ہے قابل قدر حیثیت رکھتی ہے خدا کا کوئی کام عبث اور بیکار نہیں ہوتا اس نے ہم کو یہ دور زندگی عطا کیا، اگر ہم کو مارنا ہی منظور تھا تو پھر زندگی عطا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اب آپ ملاحظہ فرمایئے کہ تعلیم وہی درحقیقت کامیاب تعلیم کہی جاسکتی ہے جو مفاد قدرت کو پورا کرنے والی ہو وہی تعلیم کامیاب ہوسکتی ہے جو نوع کو باقی رکھنے والی ہو، لیکن اگر تعلیم ایسی ہو کہ اس تعلیم پر عمل کرنے سے نوع انسانی ہی فنا ہوجائے تو ایسی تعلیم کبھی کامیاب تعلیم نہیں کہی جاسکتی اگر دنیا حقیقی طور سے پابندی اختیار کرے انجیل کی تعلیم کی، یعنی انجیل کی تعلیم کے مطابق ہر شخص شادی کرنا موقوف کردے ہر شخص جنگل میں نکل جائے پہاڑوں کے غاروں میں خدا کی عبادت میں مصروف ہوجائے تو چند روز میں نسل انسانی ہی باقی نہ رہے گی نوع بشری ہی ختم ہوجائے گی اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سلسلہ کائنات جس کو خدا نے اشرف المخلوقات قرار دیا تھا اس کا نقش ہی مٹ جائے گا بھلا خدا اپنی طرف سے ایسی تعلیم کب دے گا جو خود اس کے مفاد ایجاد کے خلاف ہو؟ ایسی تعلیم کبھی خدائی تعلیم نہیں ہوسکتی، یعنی ہم ایک دن کے لئے بھی خدا کی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اس نے ایسی تعلیم دی ہو جس سے نسل انسانی فنا کے قریب ہوجائے! حقیقتاً کامیاب تعلیم وہی کہی جاسکتی ہے جو انسانی زندگی کو موجود رکھتے ہوئے نسل انسانی کو باقی رکھنے کی صورتیں پیدا کرتی ہو اور آخرت کے اوپر توجہ بھی قائم رکھے یہی وہ تعلیم ہوسکتی ہے جو نوع انسانی کی صحیح طور سے رہنما ہوسکتی ہے اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ تعلیم کبھی ممنوع العمل نہ ہوگی جو تعلیم عیسائیوں نے دی اس کے متعلق جب خود عیسائی عمل کرکے دکھالیں تب ان کو حق ہوگا کہ ہمارے سامنے پیش کریں۔

میں کہتا ہوں کہ ایک سال عیسائی اس پر عمل کرکے جو ان کی انجیل میں مذکور ہے پھر ہم کو دعوت دے کہ ہم بھی اس پر عمل کریں ہم جانتے ہیں کہ اس وقت اپنی اپنی مردم شماری کو زیادہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے آج اگر عیسائیوں کی تعلیم پر عمل ہوجائے تو دنیا ختم ہوجائے، سیاست منقلب ہوجائے، حکومت فنا ہوجائے، عیسائیوں کی تعلیم اس وقت جب خود

عیسائیوں کے لئے غیر ممکن العمل ہے تو انہیں حق کیا ہے کہ دنیا کے سامنے پیش کر کے دعوت عمل دیں، یہ مسلمانوں کو فخر ہے کہ ان کی تعلیم اتنی جامع ہے اور اتنی منشاء قدرت کے مطابق ہے کہ اگر وہ دنیا کے سامنے پیش کریں تو ان میں کا ہر فرد اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ "میں اس پر عمل کر سکتا ہوں اس لئے تم کو دعوت دیتا ہوں" یہ جو دنیا اور آخرت میں تفریق کر دی تھی کہ کسی نے دنیا کو سب کچھ سمجھا اور آخرت کو کچھ نہیں سمجھا اور کسی نے آخرت کو سمجھا اور دنیا کو کچھ نہ سمجھا۔ اسلام نے آ کر نقطہ اعتدال پیش کیا کہ ہم نے جو تمہارے لئے موجودہ زندگی کو قرار دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانے کو ناجائز نہیں قرار دیا، اس نے موجودہ زندگی کو محترم قرار دیا۔ اس نے موجودہ زندگی کو ایک عزت دار چیز قرار دیا، یہاں تک کہ خود انسان اگر کسی وقت اپنے نفس کو وقتی جذبات سے مجبور ہو کر ہلاکت میں ڈالنے کو تیار ہو جائے تو وہ روکتا ہے:۔

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

خبردار! اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔

اس لئے کہ وہ ہمارے نفس پر ہم سے زیادہ حقدار ہے، ہمیں اپنے نفس کی کیا قدر؟ اسے قدر ہے جو درحقیقت اس نقش کا نقاش ہے اور یہ فطرت کا تعلق ہے کہ جو چیز کسی شخص کو بغیر محنت ومشقت کے مل جاتی ہے اس کی کبھی قدر نہیں ہوتی، ہماری دولتیں کس طرح ہمارے ہاتھ سے گئیں؟ باپ دادا کی کمائی ہوئی تھیں ہم نے محنت نہیں کی تھی، ہم نے قدر بھی نہیں کی انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا تھا، اس کو پانی کی طرح ہم نے بہا دیا، اس لئے کہ ہمیں اس کی قدر نہ تھی اسی طرح نفس کا وجود، انسان کو اس کی کیا قدر؟ کسی اور کا عطیہ ہے انسان کو نعمت وجود عطا کر دی گئی ہے انسان ہر وقت جذبہ سے متاثر ہو کر اس وجود کو فنا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ جو قدر شناس ہے اس کو وہ روکتا ہے۔ خبردار! تجھے کیا حق ہے کہ اس زندگی کو فنا کر دے میں نے یہ زندگی قرار دی ہے مجھے حق ہے اس نے انسانی زندگی کو محترم قرار دیا، قتل نفس کو بڑے سے بڑا گناہ قرار دیا، شرک کا مرادف قرار دیا۔ دوسروں کے نفس کو محترم بنایا اپنے منفس کو محترم بنایا۔ اپنے خاص عزیز، رشتہ دار یہاں تک کہ اپنی اولاد تک کو قتل کرنے کا حق نہیں دیا، وہ مشرکین قریش تھے جو اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے اس ڈر سے کہ اگر زندہ رہیں تو سامان

زندگی کہاں سے آئے گا ممکن ہے کہ ذلت کی کوئی بات ہو جائے اس لئے قتل کر دیا کرتے تھے مگر منع کیا گیا، ارشاد ہوا!۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۚ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ.

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو، آخر تم کو بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں ان کو بھی ہم ہی دیں گے۔

لیکن یاد رہے کہ تاریخ اپنے تئیں پلٹا یا کرتی ہے، دنیا پچھلے پاوں جارہی ہے جس طرح سے وہ جہالت کا دور دورہ تھا جس وقت ہر طرف ظلمت چھائی ہوئی تھی، اس وقت اولاد کو قتل کیا جاتا تھا، وہی طریقے اب بھی جاری ہو رہے ہیں وہی راستے اب بھی کھولے جارہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پرانی بدتہذیبیوں کو اچھائیوں کا بھیس پہنا دیا گیا ہے پرانے زمانے میں اگر اولاد کو قتل کیا جاتا تھا تو اب ایسی صورتیں اختیار کی جارہی ہیں کہ آنے والا نفس دنیا میں آنے ہی نہ پائے اور قتل کر دیا جائے۔ نتیجہ میں دونوں ایک ہیں، نقطہ نگاہ متحد ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ذہنیت ملتی جلتی ہوئی ہے۔ ہم اپنے نزدیک سمجھ رہے ہیں کہ فکروں میں روشنی پیدا ہو رہی ہے انسانیت ترقی کر رہی ہے لیکن ترقی کا اصل نقطہ ہم سے بہت دور ہے جس کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں وہ حقیقتاً تنزل ہے، طرز عمل مختلف ہے لیکن جب نقطہ نگاہ ایک ہوا تو حقیقتاً عمل متحد ہے وہ اقتصادی مشکلات سے ڈر کر قتل کرتے تھے اب والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں پھر وہ اکثر ایک جذبہ غیرت کے تحت میں لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے تھے، اس میں ایک قابل تعریف جذبہ شریک تھا چاہے حد اعتدال سے بڑھنے کے باعث مورد مذمت ہو جائے مگر آج کل کی دنیا ایسی ہوگئی کہ لڑکیوں کو ہی نہیں بلکہ لڑکوں کو بھی فنا کرتے ہیں یہ ایک نظریہ کی غلطی ہے، بہت بڑی۔ ان کے نقطہ نظر میں اور ان کے نقطہ نظر میں اتنا فرق ہے کہ وہ ڈر کے لحاظ سے خوف فقر و فاقہ کے لحاظ سے صرف اس عنصر کو فنا کرتے تھے جس سے عار و ننگ کا خوف تھا۔ لیکن اس عنصر کا جو کار آمد ہو سکتا تھا باقی رکھتے تھے مگر آج کی دنیا کی یہ عقل مندی ہے کہ جس طرح سے کمزور صنف کو فنا کرتے ہیں اسی طرح طاقتور صنف کو بھی جس سے درحقیقت دنیا کا نظام قائم ہے، جو درحقیقت منافع کی حاصل کرنے والی ہے جس کے معنی ہیں افراد کا سب اس کو بھی دنیا سپرد خاک کر رہی ہے اس کے معنی

یہ ہیں کہ ان کا طرز عمل ان کے طرز عمل کی نسبت حکیمانہ تھا کیونکہ ولادت کے قبل ذکور اور اناث کی تفریق نہیں ہوسکتی انہوں نے جو انسانی ہستیوں کے فنا کرنے کا طریقہ قرار دیا ہے اس میں سب فنا ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اسلام دونوں کا مخالف ہے اسلام یہ کہتا ہے کہ جو نقش صفحہ قرطاس پر آئے وہ وجود کا حقدار ہے اور جو نقش بنے وہ باقی رہنے کے قابل ہے اس لئے کہ نقاش کا قلم غلطی نہیں کرتا، مٹا دینے کے قابل ہے وہ جو حرف غلط کی حیثیت رکھتا ہو جس کے قلم کی گردش نقطہ صحت پر ہو، وہ کبھی مٹانے کے قابل نہیں، اس کی بقا میں حکمت ہے جب وہی چاہے تب فنا کرے۔ ہم کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کی کسی مخلوق کے فنا کا باعث قرار پائیں، اسلام نے دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا کہ موجودہ زندگی قابل احترام ہے مگر موجودہ زندگی کو صرف ایسے طریقہ سے صرف کرو کہ یہ زندگی پیش خیمہ قرار پائے آئندہ زندگی کا یہ زندگی تمہید عمل قرار پائے حیات آخرت کی، میں نے دنیا کی مذمت ضرور دیکھی ہے لیکن یاد رکھئے مذمت "اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" کی ہے۔

"اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" ذرا عربی داں طبقہ سے دریافت کر لیجئے اپنے اپنے محل پر اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے "حیوۃ الدنیا" مضاف مضاف الیہ کی ترکیب کے ساتھ اس کے معنی ہوئے اس نشاءۃ دنیا کی زندگی لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ "اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے "اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" جو قابل مذمت ہے اور ایک وہ زندگی جو بلند درجہ رکھتی ہے، جو علو مرتبہ رکھتی ہے، وہ زندگی قابل مذمت نہیں ہے۔ یہ مذمتیں جو کچھ ہیں وہ "اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" کی ہیں۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم اس دنیا میں اس طرح زندگی گذارو کہ وہ "اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" رہے ہی نہیں بلکہ وہ دنیا درحقیقت دین بن جائے، وہ دنیا درحقیقت منزل آخرت بن جائے یہ اس دنیا کی مذمت ہے جس کا طرز زندگی انسان کی پست ذہنیت کا قرار دیا ہوا ہو یہی وہ ہے جسے درحقیقت "اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اصل دنیا کی زندگی؟ وہ تو اگر نہ ہوتی تو آخرت کی منزل ہی نہ آتی، وہ دنیا کی زندگی وہی ہے جس سے انبیاء و مرسلین مستثنیٰ نہیں رہے، وہ زندگی درحقیقت سرچشمہ ہے تمام خیرات و برکات کا وہ

زندگی وہ ہے جس پر شکر کیا ہے شکر کرنے والوں نے جس وقت کوئی جنازہ آپ کی نظر سے گذرے تو آپ کے لئے مستحب ہے کہ آہستہ سے اپنے دل میں یہ دعا پڑھیئے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَجْعَلْنِیْ مِنَ السَّوَادِ الْمُخْتَرَمِ.

شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھ کو اس جماعت میں سے قرار نہیں دیا جو مردہ ہوئے ہیں۔

لوگوں کو اس کے معنی سمجھنے میں دشواری ہوئی ہے بعض نے کہا کہ فنا ہونے کے معنی ہلاکت ابدی میں مبتلا ہونے کے ہیں لیکن موقع ومحل کے لحاظ سے اس معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے معنی وہی ہیں کہ شکر ہے کہ مجھ سے نعمت زندگی سلب نہیں ہوئی ہے۔

یقیناً خدا کا ہر کام اس کے محل پر موجب شکر ہے جب تک زندگی ہے زندگی قابل شکر ہے، اگر موت آجاتی تو موت قابل شکر ہوتی۔ جب تک زندگی ہے خدا کی طرف سے وہ انسان کے لئے بہتر سے بہتر نعمت ہے:۔

لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ.

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اس عبادت کو اسلام نے مستحسن نہیں قرار دیا کہ تمام نوع انسان سے علیحدہ ہو کر خدا کی عبادت کی جائے، اسے کوئی چیز نہیں سمجھا، عیسائیت کی وہ تعلیم کہ خدا کے ملکوت میں وہ داخل نہ ہوگا جو شادی کرلے، اسلام نے یہ کہا کہ "ہماری جماعت سے وہ نہیں ہے جو شادی نہ کرے" یعنی جو پابند ہو اپنی شادی نہ کرنے کا وہ ہماری جماعت سے خارج ہے۔

اس طرح ثابت کیا کہ اسلام وہ ہے جو نوع انسان کے بقا کا ذمہ دار ہو کر آیا ہے فنا کا نہیں، مٹانے کا نہیں وہ تعلیم کہ جس نے ایک وقت کھایا اور دوسرے وقت کے لئے اٹھا کر رکھ دیا وہ ملکوت آسمان میں داخل نہیں ہوسکتا، اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے اسلام بے شک مال و دولت کو خزانوں میں رکھنے کے مخالف ہے اسلام یقیناً سرمایہ داری کے اس معنی میں مخالف ہے کہ تمام دولتوں کو سمیٹ سمیٹ کر خزانوں میں رکھا جائے، اسلام کے نقطہ نظر میں مال و دولت فائدہ اٹھانے کے لئے ہے اس لئے نہیں ہے کہ اس کو صرف دیکھ لیا جائے اور اس کے ہونے سے دل خوش کرلیا جائے۔

اس سرمایہ داری کے اسلام خلاف ہے اس کی وجہ کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ اسلام انفرادی زندگی سے زیادہ اجتماعی زندگی کا حامی ہے میں نے انفرادی زندگی کے متعلق عرض کیا کہ اسلام نے اس کو محترم قرار دیا یہاں تک کہ انسان کے لئے خود اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنا ناجائز قرار دیا لیکن اجتماعی زندگی اس قدر محترم قرار دی کہ یہ انفرادی زندگی جس کے لئے وہ خاص خاص اوقات میں اپنے فرائض تک کو اٹھالیتا ہے یعنی نفس کو اگر کسی نقصان کا خوف ہے تو وہ اپنے حکم کو آپ سے برطرف کرلیتا ہے۔ آپ ملاحظہ کیجئے کہ وضو کا حکم ہے نماز بغیر وضو کے صحیح نہیں ہے، اگر خدانخواستہ کوئی مرض ہے قدرت کی طرف سے حکم ہے کہ وضو نہ کرے تیمم کرلے۔ اس طرح یہ بتایا کہ انسانی زندگی اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم اپنی ذاتی عبادت بدل دیتے ہیں تمہاری زندگی کی حفاظت کے لئے وہ مرض بھی کوئی ایسا مرض نہیں جو لاعلاج ہو ایسا بھی نہیں کہ سخت دشوار ہو امراض مزمنہ نہیں جن کا علاج ممکن نہ ہو، معمولی سی تکلیف جو مرض سمجھی جاسکے اس کو بھی قدرت نہیں گوارا کرتی، سفر میں انسان کی طبیعت پر دشواری ہوتی ہے یہ خیال نہ کیجئے کہ سابقہ زمانہ کا سفر اس میں صعوبتیں تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود سفر کے مفہوم میں ایک گرانی داخل ہے۔ انسانی فطرت ہے یعنی آپ انتہا سے زیادہ راحت کے ساتھ سکنڈ کلاس میں فرسٹ کلاس میں سفر کیجئے، جو بات گھر میں ہے وہ سفر میں نہیں محسوس ہوگی، اسی فطرت انسانی کی نباضی کرتے ہوئے قدرت کی طرف سے نمازیں نصف کروی گئیں حکم دیا گیا کہ سفر میں جاتے ہو تو ہم تم سے چار رکعتوں کے بجائے دو ہی قبول کریں گے، یونہی روزے بلا عذر نہیں چھوڑے جاسکتے تھے، سفر میں چھوڑ دو پھر کبھی رکھ لینا۔

اس طرح سے بتلایا کہ تمہاری جسمانی زندگی کہاں تک ہم کو عزیز ہے۔ اس طرح تمام ان غلطیوں کا سدباب کیا جو درحقیقت خدا کی رضامندی کو انسان کی ایذائے نفس میں منحصر قرار دیتی تھی وہ دنیا کا نظریہ ہے کہ جتنا ہم اپنے نفس کو خواہ مخواہ کی تکلیف دیں گے اتنا ہی خدا ہم سے رضامند ہوگا اسلام نے غلط ثابت کیا۔ اس نے ہمارے لئے ہر طرح کی آسانیاں قرار دیں:۔

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔

خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

اس نے اسی نوعیت کے قوانین قرار دیے کہ کوئی حکم شرعی بلا استثنا ہماری طرف سے اس

میں دشواریاں اور ایذا پیدا ہو جائیں تو ہم اس حکم کو برطرف کر دیں گے:۔

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ

تمہارے لئے مذہبی احکام میں عسر و حرج نہیں قرار دیا گیا ہے قاعدہ بنا دیا اور کلیہ قرار دے دیا، در حقیقت یہ اسلام کی جامعیت ہے اسلام کی ہمہ گیری اور بقا کی دلیل ہے۔ اسلامی شریعت جامع اور مکمل ہے اور کوئی جگہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں اور یہ خاص رمز ہے اسلام کے عموم و شمول کا باعتبار زمانہ و دوام و بقا کے۔

یقیناً اسلام کی شریعت اس مختصر مجموعہ قرآن کے اندر ہے جو ہماری نظروں میں ایک محدود کتاب ہے اور ان احادیث میں ہے جن کا اگر ذخیرہ جمع کیا جائے جو صحیح اور قابل اعتبار ہیں تو وہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا، اس میں دنیا کے تمام جزئیات یعنی خاص خاص مواقع کے احکام نام لے کر کہاں مذکور ہیں لیکن کلیات کے تحت میں دنیا کے ضروریات باعتبار موقع و محل سب بتلا دیئے ہیں، خاص زمانہ کے اعتبار سے خاص اشخاص کے اعتبار سے شریعت اسلام میں خصوصیت کے ساتھ ان احکام کا اندراج نہیں ہے لیکن اسلام کی شریعت میں کلیات و قواعد اتنے واضح موجود ہیں کہ ایک سمجھنے والا انسان ہر موقع و محل کی مناسبت سے ان کلیات سے احکام نکال سکتا ہے اور اس بنا پر وہ شریعتیں جو اس سے قبل تھیں وہ اس کی حقدار نہ تھیں کہ ہمیشہ کے لئے رہنمائی کر سکیں، اس لئے کہ ان کے ضروریات محدود تھے اور اس لئے احکام بھی محدود، شریعت اسلام نے ایسے احکام و قوانین قرار دیے جو ہر موقع پر اور ہمیشہ رہنمائی کے لئے کافی ہوتے ہیں یقیناً ہم کو کبھی شریعت میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوتی ہم کو کبھی حکم اسلام کے علاوہ ضرورت کے موقع پر کسی خاص حکم کے بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ہر موقع کے لحاظ سے خود شریعت اسلام میں احکام موجود ہیں اسی لئے یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں جس واقف کار سے احکام دریافت کئے جائیں وہ وہی ہو کہ جو اس زمانہ میں موجود ہو اور نتیجہ نکالنے کی قابلیت رکھتا ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے تاکہ اسلامی شریعت کا جوہر خاص کہ وہ ہمیشہ رہنمائی کر سکے باقی رہے، اسلام کے احکام ہرگز دشواری اور سختی پر مبنی نہیں ہیں مگر یاد رکھئے کہ ایک دشواری وہ ہوا کرتی ہے جو پابندی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، ہر آسان سے آسان چیز جب پابندی عائد ہو جائے تو طبیعت پر گراں گذرتی ہے یہ پابندی وہ ہے جو حکم کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ دشواری

وہ ہے جو حکم سے جدا نہیں ہوتی اسی وجہ سے حکم کا نام تکلیف رکھا گیا ہے کہ وہ انسان کی طبیعت پر ایک بار ضرور ہوگا صرف پابندی کی بنا پر، اس قسم کی سختی جو اصل پابندی کا نتیجہ ہو وہ اسلام کی طرف سے برطرف نہیں ہے اس لئے اصل احکام شریعت کے مقابلہ میں دنیا اگر عسر وحرج کے نفی والی آیتوں کو پیش کرے تو وہ استدلالی غلطی ہے اگر ہم حدیث سے پردے کو ثابت کریں؟ کہیے، خدا تو کہتا ہے" یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ "پھر یہ سختی کیسی؟ جناب والا سختی جو کسی حکم کا لازمی نتیجہ ہو وہ برطرف نہیں ہے بلکہ کسی حکم شرعی کی پابندی میں غیر معمولی صورتوں کے لحاظ سے اتفاقی مواقع کی حیثیت سے غیر معمولی سختی پیدا ہو تو وہ برطرف ہے۔

اگر" مَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ "اور" مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ "اس کا مفہوم اتنا ہی عام ہوتا تو پوری شریعت ہی جاتی رہتی اسلام نے ہر حیثیت سے ہمارے لئے آسانیاں قرار دیں۔ شریعت نے یقیناً ہمارے بقائے انفرادی کا احترام کیا، مگر اجتماعی زندگی کے مقابلہ میں وہ انفرادی زندگی کو کوئی چیز نہیں سمجھتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ جس وقت مرکز اجتماعی پر مصیبت آرہی ہو جس وقت کہ ہیئت اجتماعی پر کوئی بلا آرہی ہو تو اس مفاد اجتماعی کے بقا کے لئے اس انفرادی زندگی کو فنا کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیے۔

یہ جہاد کا حکم کیا ہے؟ وہ انسان کی انفرادی زندگی جس کی حفاظت کے لئے احکام میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں آج وہ موت کے منہ میں بھیج دی جاتی ہے، آج وہ سلاح جنگ کے مقابلہ میں بھیج دی جاتی ہے فنا ہونے کے لئے اس کے معنی یہی ہیں کہ مفاد اجتماعی کے مقابلہ میں مفاد انفرادی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلام نے بے شک انسان کے لئے مال و دولت کو جائز قرار دیا ہے مگر اس وقت تک کہ انفرادی ترقی اجتماعی ترقی کے خلاف نہ ہو جائے، اسلام کا نقطہ نظر انسان کی زندگی کے متعلق یہ ہے کہ ہر شخص ترقی کرے ایک فرد رہتے ہوئے اس نوع کی جس کی وہ ایک ہستی ہے ہر فرد ترقی کرے مگر فرد قوم ہونے کی حیثیت سے، در حقیقت قوم تو افراد کا مجموعہ ہی ہوتی ہے اس لئے افراد کی ترقی قوم کی ترقی ہوئی، مگر یاد رکھئے کہ افراد کی ترقی قوم کی ترقی اسی وقت ہوگی جب احساس قومیت کے ساتھ ہو، اور اگر احساس قومیت کے ساتھ نہ ہو تو افراد کتنی بھی ترقی کر جائیں مگر قوم پھر

بھی پستی کی حالت میں ہوگی کیونکہ قوم تو نام ہے رشتہ اجتماعی کا، جو مختلف افراد میں اتصال رکھتا ہے ورنہ جسم کا اجتماع، باہمی نشست کی حیثیت سے، اجتماع مکان کی قرب کی حیثیت سے، اجتماع ایک قوم کو افراد نہیں بنا دیتا۔ بہر حال ایک قوم کی تشکیل جو ہوتی ہے وہ اس رابطہ کی وجہ سے ہوتی ہے جو ان افراد قومی میں بحیثیت شیرازہ قومی کے قائم ہو جب تک یہ رابطہ باہمی قائم ہے قوم ہے اگر یہ فنا ہوا تو قوم جاتی رہے گی چاہے اس کے افراد جتنے بھی کیوں نہ ہو۔

درحقیقت اسلام تو ایسے ہی انفرادی زندگی کو چاہتا ہے جو احساس قومیت کے ساتھ ہو، اگر آپ نے مال و دولت انفرادی حیثیت سے خزانوں میں بھر کر رکھ لیا جس سے نہ آپ کو فائدہ پہنچتا ہے نہ دوسروں کو، تو یہ مال و دولت آپ کے لئے سبب ترقی بنے، لیکن بحیثیت قوم آپ کے لئے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ میں تین سال پہلے یہ بیان کر چکا کہ درحقیقت یہ سرمایہ زندگی جو ہے اس کی مثال خون کی طرف ہے جس انسان میں، جس طرح یہ جب تک جسم انسان میں گردش کرتا ہے تمام شریان وعروق میں چلتا پھرتا ہے اس وقت تک اس جسم کی زندگی ہے اور اگر یہ خون کسی جگہ اس جسم میں منجمد ہو کر رہ جائے اور دوسرے اعضاء و جوارح اس سے محروم رہ جائیں تو یہ اس جسم کا مرض ہوگا، اور اس کی فنا کا پیش خیمہ قرار پائے گا اسی طرح اگر یہ خون کسی منفذ کو پا کر باہر بہنے لگے تو پھر انسان کا جسم فنا ہو جائے گا۔ ان میں سے ہر ایک مرض ہے انسانی زندگی کو فنا کرنے کا، یہ تمام امراض ہیں مستقل۔ ایک یہ کہ خون منجمد ہو کر ایک جگہ رہ گیا، انسان مفلوج ہو گیا کچھ اعضا بیکار ہو جائیں گے نتیجہ میں وہ اعضا بھی جو اس وقت خون رکھتے ہیں فنا ہو جائیں گے، ایک یہ ہے کہ کوئی ایسی رگ قطع ہو گئی کہ خون بہنے لگا پھر بھی انسانی زندگی فنا ہو جائے گی، ان میں سے ہر ایک وہ ہے جو انسانی زندگی کو فنا کرنے کا باعث ہے۔

وائے برحال قوم! جب اتنے امراض پیدا ہو جائیں تو کبھی ان افراد کو اپنی زندگی پر ناز نہ کرنا چاہیے ایک طرف یہ مرض کہ بعض لوگ صاحب دولت بن بیٹھے، انہوں نے مال و دولت خزانوں میں محفوظ کر لیا، دوسرے فاقے کرتے ہیں تو ان کی بلا سے، ان کو یہ گھمنڈ نہ کرنا چاہیے کہ ہمارے پاس مال و دولت ہے اگر قوم فنا ہو گئی تو کوئی فرد چھوٹے گی نہیں یہ تمام بحیثیت افراد قوم فنا ہو جائیں گے اور اس کے باعث وہ خود ہوں گے۔

دوسری طرف درآمد و برآمد کا عدم توازن ہماری آمدنی کم اور مصارف زیادہ، ہمارا سرمایہ زندگی دوسروں کے پاس چلا جارہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ہمارا جتنا سرمایہ ہے وہ سب چلا جائے گا جائدادیں چلی گئیں، مکانات چلے گئے زمینیں چلی گئیں، سود در سود کے ذریعہ سے ہمارا جتنا سرمایہ تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا، تجارت چھوڑ دی، اسے عار و ننگ سمجھ لیا، اسی طرح جتنے ذرائع آمدنی کے تھے ترک کردئے مگر ضروریات قائم، سرمایہ ختم ہو چکا، پرونوٹ پر روپیہ لیا سود در سود مقرر کیا، اسلام کی تعلیم پر ہم نے عمل نہیں کیا اسلام نے ہمارے لئے سود دینا اور لینا حرام قرار دیا تھا ہم نے اسلام کی اس تعلیم سے غلط فائدہ اٹھایا کہ غیر مسلم سے معاملات جائز ہیں۔ اس کے معنی یہ ہم نے سمجھے کہ سود دینا جائز ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں غیر مسلم کو سود دینا تو دو حیثیتوں سے حرام ہے ایک طرف سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے دوسری طرف اعانت کفار ہونے سے حرام ہے۔ ایک طرف گناہ کیا دوسری طرف اعانت کفار کے باعث ہوئے۔

اس طرح ہم اپنے ہاتھوں سے فنا کی منزل پر پہنچے ہم نے ایک "ضرورت" کا لفظ سن لیا، کہ ضرورت کے وقت سود جائز ہو جاتا ہے لیکن ضرورت کے معنی ہم نے یہ قرار دے لئے کہ بچہ کا ختنہ ہے ضرورت ہے ہمیں قرض لینے کی، صاحبزادے کی شادی ہے ہمیں ضرورت ہے قرض لینے، "منت" مانی ہے منت پوری ہوگئی ضرورت ہے۔

اگر ضرورت کے یہ معنی ہیں تو بغیر ضرورت کے کوئی قرض ہی کاہے کو لینے لگا؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سود نا جائز ہی نہیں "ضرورت" وہ ہے جس کے موقع پر کہا جاتا ہے کہ "مردار کھانا جائز ہے" جس وقت کہ آپ مردار کھا سکتے ہیں اس وقت سودی روپیہ لینا بھی جائز ہے بغیر اس کے کسی وقت بھی جائز نہیں۔ اگر ہم اسلام کے قوانین پر عمل پیرا ہو جائیں تو آج ہمارے لئے دور زندگی پیدا ہو سکتا ہے مگر جب ہمیں خبر ہی نہیں تو نتیجہ فنا ہے اور کچھ نہیں۔

دین و دنیا

دین و دنیا کے معاملہ میں یہ افتراق کہ کچھ لوگوں نے صرف آخرت پر نظر کی، دنیا کو نظر انداز کردیا، کچھ لوگوں نے موجودہ حیات دنیا پر نظر ڈالی۔ اسلام نے اس معاملہ میں ایک متعدل

حکیمانہ طرز عمل یہ پیش کیا کہ تم اس دنیا ہی کے ضروریات کو پورا کرو تم اس دنیا کی زندگی کے تمام ان لوازم کے ساتھ جو اس دنیا کے لئے ضروری ہیں زندگی بسر کرو مگر اس کے ساتھ ساتھ آخرت کے خیال کو بھی نہ بھلاو، تمام وہ تعلقات جو انسان کو دنیاوی زندگی کے ساتھ حاصل ہیں تمام وہ ضروریات زندگی جو قدرتی قویٰ کے لحاظ سے انسان کے لئے لازم ہیں ان کے دروازے بند نہیں کئے گئے، قدرت نے اگر قوت ذائقہ عطا کی تھی تو غذا سے منع نہیں کیا قوت سامعہ عطا کی تھی تو آوازوں کے سننے سے روکا نہیں، ہر طاقت جو عطا کی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کا انسان کو حق دیا "أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ" تمہارے لئے پاک و پاکیزہ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں وہ حلال ہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ.

ترجمہ: ان سے کہو کون ہے جس نے حرام کر دیا خدا کی پیدا کی ہوئی زینتوں کو اور پاک و پاکیزہ رزق کو جو خدا نے عطا کیا ہے۔ اس نے بہتر سے بہتر غذا کھانے کا حق دیا بہتر سے بہتر لباس پہننے کا حق دیا۔

لیکن ہر چیز میں اپنی طرف سے ایک پابندی قرار دے دی تا کہ ہر چیز سے لذت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ فرض شناسی کا بھی احساس رہے۔ آپ کو بہتر سے بہتر غذائیں کھانے کا حق دیا مگر:۔

"أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْخَبَائِثُ" فریق قرار دے کر اس میں ہر موقع پر اپنی یاد بھی دلا دی۔

اگر آپ جائزہ لیجئے تو وہ چیزیں جو ماکول اللحم میں داخل ہیں اپنے مزے کے اعتبار سے کوئی پست درجہ نہیں رکھتیں ان میں بہت سے لذیذ چیزیں ہیں یہ نہ سمجھئے کہ جو مزے کی چیزیں تھیں ان کو قدرت نے روک دیا بلکہ ان میں بہت سی چیزیں قدرت نے ہمارے لئے حلال قرار دیں یہ اور بات ہے کہ کسی کو شئے ممنوع ہی میں لذت محسوس ہو "الانسان حریص علی ما منع" وہ لذت اعتباری لذت ہوتی ہے جو شئے ممنوع سے پیدا ہوتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ان چیزوں میں جن کو قدرت نے جائز قرار دیا ہے لذت مفقود نہیں ہے لیکن پھر بھی روک دیا، ان چیزوں سے جو اس کی نظر میں حکیمانہ حیثیت سے انسانی زندگی کے لئے مضر تھیں ان کو روکنے کا

یہ نتیجہ ہوا کہ انسان بہتر سے بہتر غذا ڈھونڈ کر یہ احساس رکھے کہ "وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا" اس طرح سے انسان نے لذت بھی حاصل کی اور فرض شناسی کے ساتھ خدا سے لو بھی لگائے رہا، اسے بہتر سے بہتر لباس پہننے کی اجازت دی مگر پابند کر دیا کہ ریشم نہ پہنو اس کے بعد آپ بیش قیمت سے بیش قیمت لباس پہنئے کوئی اعتراض نہیں، انسان ڈھونڈ کے عالم کے بازاروں میں بہتر سے بہتر لباس اپنے لئے اختیار کرے، جو انتہا سے زیادہ اس کی توجہ کو مبذول کرتا ہو، یہ سب کچھ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا خیال لگا رہے کہ حریص نہ ہو، اجزائے غیر ماکول اللحم سے نہ ہو اس طرح انسان نے لذت دنیا کو بھی حاصل کیا مگر خدا کو بھی نہیں بھولا، اس کے بعد انسان کے لئے قدرت نے نظام بشری کی اصلاح کے لئے ایسے ضروریات مہیا کئے کہ جن کی وجہ سے نسل انسانی کے جو دو طبقے قرار دیے ہیں، صنف ذکور واناث ان کا ربط پیدا ہو سکے، انجیل کی تعلیم اپنے مقام پر کہ وہ ملکوت آسمان میں نہیں داخل ہوگا جو شادی کرے اس کے معنی یہ ہیں کہ جو تفرقہ قدرت نے قرار دیا تھا وہ عبث ہے خدا کا ایک طرز عمل بیکار قرار پاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نسل انسانی فنا کی منزل کے قریب آجائے مگر پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد:۔

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي.

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری جماعت سے وہ شخص خارج ہے جو انکار رکھتا ہو شادی کرنے سے، اس طرح سے نسل انسانی کے باقی رکھنے کی فکر کی گئی، اس کے بعد انسان کو اختیار دیا کہ وہ فائدہ اٹھائے خدا کے احکام سے اور خدا کے احکام پر عمل کرے۔

لیکن ایسی پابندیاں عائد کر دیں جو نظام بشری سے تعلق رکھتی ہیں، مثلاً شوہر دار عورت سے عدم جواز کا حکم، غیر شوہر دار سے عقد کرنا جائز لیکن اس میں بھی خاص الفاظ اور صیغے مقرر کر کے یہ چاہا ہے کہ اگر انسانی خواہشیں پوری ہوں بھی تو فرض شناسی کے احساس کے ساتھ یعنی صیغہ خاص کا حکم اس لئے تھا کہ انسان کو وہ خواہشیں جن کی حیثیت یہ ہے کہ خدا کی یاد کو بھلا دیں، اس میں بھی ایسی صورتیں اختیار کر لی جائیں کہ انسان ان موقعوں پر بھی خدا کی یاد کو نہ بھولے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں کہ خالی مادی صورت رکھتی ہیں ان میں بھی اسلام نے اپنے حکیمانہ طرز عمل سے روحانیت کی روح پھونک دی ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا فرض شناسی کی تعلیم ہوگی۔

ایک وہ محل وموقع ہے ایک وہ جگہ ہے جہاں پر تمام موانع مرتفع ہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہے مگر انسان کو اس وقت بھی یاد آجاتا ہے کہ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ کچھ الفاظ زبان پر جاری کرلئے جائیں۔

اس وقت تک ہمارے لئے اقدام کرنا مستحسن نہیں ہے، درحقیقت اسلام نے دنیا کو سمونا چاہا ہے آخرت میں اور یہ چاہا ہے کہ تم اپنی ذاتی خواہشوں کو پورا کرو مگر احساس فرض کو بھی نہ چھوڑو اور خدا کی یاد دل سے نہ نکلنے پائے اس نے یقیناً ایسی چیزوں سے روکا جو خدا کو بھلا دیتی ہیں، لہو ولعب سے اس لئے منع کیا کہ وہ خدا کی یاد کو بھلا دیتے ہیں۔ "لہو" کا کوئی معیار ہی مقرر نہیں لہو کو لہو اس لئے کہتے ہیں "یلھی عن ذکر اللہ" وہ خدا کی یاد سے غافل بنا دیتا ہے۔ ایسی چیزوں کو جو خالص مادیت کا لباس پہن کر روحانیت سے الگ ہو جائیں ان سے منع کر دیا لیکن ذرائع صحت جسمانی کو جائز رکھا میں نے کل عرض کیا کہ احکام تک برطرف کر دئے جاتے ہیں انسان کی صحت جسمانی کے لحاظ سے، اس نے ذرا ذرا سی صورتوں میں انسانی ضروریات کا لحاظ رکھا، جسمانی ہوں عملی ہوں، روحانی ہوں، ہر قسم کے ضروریات، نماز! اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں ہے!:۔

اِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاهَا وَاِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَا سِوَاهَا.

اگر یہ عمل قبول ہو جائے تو دوسرے عمل میں بھی صلاحیت قبولیت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر یہ عمل رد ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ کسی عمل میں صلاحیت ہی نہیں لیکن اتنا بڑا عمل، نماز ان مواقع پر توڑ دینا جائز قرار دے دیا جہاں آپ کا کوئی نقصان ہو رہا ہو یعنی آپ کے کپڑے روپیہ پیسہ کوئی اور چیز رکھے ہوئے ہے تھوڑی دور پر، آپ کی نماز سے فائدہ اٹھا کر چور آتا ہے چاہتا ہے کہ اسے اٹھا لے جائے لیکن اسلام اس نقصان مالی کو گوارا نہیں کرتا کہ آپ چور کو کپڑے لے جانے دیجئے، آپ نماز توڑ دیجئے، آپ کا کسی پر قرضہ ہے بہ مجبوری نہیں بلکہ بہ شرارت وہ آپ کا قرضہ نہیں دیتا، آپ نماز میں مشغول ہیں اتفاق سے وہ اس وقت آجاتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اگر اس وقت آپ نے جانے دیا تو پھر ہاتھ نہ آئے گا، آپ نماز توڑ دیجئے اور اپنا قرض وصول کر لیجئے، اس کے بعد پھر نماز پڑھ لیجئے، اسلام نے اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں انسانی ضرورت کا لحاظ رکھا، بیشک جب موقعہ ہو تقابل کا دین ودنیا میں تو دین کو مقدم قرار دیجئے، یعنی ایسے موقع پر کہ

آب وضو بلا قیمت نہیں ملتا ہے اور ایک شخص کے پاس ہے مگر وہ بیش قرار قیمت کہتا ہے وہ تین چلو پانی کی قیمت پچاس روپیہ مانگتا ہے۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ کے پاس پچاس روپیہ ہیں مگر آپ دے دیں تو آپ کے ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکیں گے یہاں تو بے شک حکم نہیں ہے لیکن اگر آپ اتنے صاحب حیثیت ہیں کہ پچاس روپیہ دے دیں تو آپ کے نظام زندگی میں خلل نہ پڑے گا مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ نے خواہ مخواہ ایک پروگرام قرار دے لیا ہے کہ اس میں تبدیل واقع ہو جائے گا یہ معنی نہیں ہیں، اس مقام پر بے شک آپ پر جو واجب ہے کہ اگر کوئی دس ہزار روپیہ پر تین چلو پانی دینے پر تیار ہے تو آپ کو دس ہزار روپیہ دینا چاہیے، اس مقام پر فرض کی اہمیت بتائی گئی ہے یہاں ہماری نظر ظاہری کو اضطراب ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو دس ہزار روپیہ دے دینے کا حکم ہوتا ہے صرف تین چلو پانی کے عوض میں اس سے آب وضو کی قیمت میں دس ہزار روپیہ دلا دئے جاتے ہیں اور حفاظت کے موقع پر دس روپیہ کی گھڑی کی مثلاً حفاظت جائز قرار دی جاتی ہے کہ نماز توڑ کر دس روپیہ کی گھڑی کی حفاظت کر لو، مگر یہاں ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے دو چیزوں کو جمع کر کے دکھایا ہے۔

اول تو فرض کی اہمیت کا اندازہ کرنا تھا کہ دیکھو! یہ عمل اتنا اہم ہے کہ دس ہزار روپیہ بھی اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے، لہٰذا اگر دس ہزار روپیہ کو آب وضو ملے تو خرید کر لو۔ یہ امتحان ہے حکم خدا کے مقابلے میں ضروریات زندگی کو مقدم نہ سمجھنے کا یعنی مال و دولت ایک طرف اور خدائی احکام ایک طرف، دونوں میں تصادم تو وہاں انسانی اختیار کے آزمانے کا موقع تھا، نماز شروع ہونے کے بعد اب منزل ہے اس کے دکھلانے کی کہ انسان ضرورت کا اس کو کہاں تک خیال ہے اس وقت تک آپ آزاد تھے تو اس کی طرف سے آپ کا امتحان تھا کہ "دیکھیں تم ہمارے فرائض کے مقابلہ میں کہاں تک ایثار کے لئے تیار ہو" اب انسان اس کے شکنجہ حکم میں مقید ہو گیا۔ اب وہ اپنی مراعات دکھلاتا ہے کہ دیکھو "مجھے تمہارا خیال ہے" کہ میں خواہ مخواہ اتنا بھی نقصان گوارہ نہیں کرتا، اس کے علاوہ جب دس ہزار روپیہ قیمت میں آب وضو کے دلا دئے وہ اور بات تھی اس لئے کہ انسان وہی ہے جسے ذوق اطاعت ہو۔ اس کو اسی میں مسرت حاصل ہوگی یاد رکھئے کہ اسے دس ہزار دے کر بھی خوشی ہوئی کہ میں نے وضو کر کے نماز پڑھ لی، اور دس ہزار

روپیہ کے عوض میں انسان نے عبادت ایسی لذیذ شے حاصل کی وہاں چور اور ڈاکو آ جاتا ہے دس روپیہ سہی مگر بظلم وتعدی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اب یہ گناہگار کی ہمت افزائی تھی کہ یہاں لے جانے دیا جائے وہ چند روپیہ کی قدرت کیوں گوارا کرے۔ اگر یہ دروازہ کھول دیا جاتا تو مجرموں کے لئے راستہ صاف ہو جاتا، قدرت نے یہ حکم دے کر ہمارے سامنے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا کہ یہ نہ سمجھنا عبادت مال دنیا کے مقابلہ میں سبک ہے یہ باحقیقت چیز ہے درحقیقت روح حیات ہے عبادت، مال کے مقابلہ میں سبک نہیں ہے پھر اپنی مصلحت پروری اور انسانیت نوازی کا ثبوت یہ دیا جو بیان کیا گیا۔غرض اسلام نے انسانی زندگی کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کیا، وہ یہ کہ ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہوئے، روحانیت کا بھی جوہر محفوظ رکھا وہ کسی طرح سے اس چیز میں اپنی خوشنودی ورضامندی نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ آپ اپنے نفس کو تکلیف دیجئے۔ آپ دو گھنٹہ دھوپ میں کھڑے ہو جائیں، اس لئے کہ خدا راضی ہو، خدا اس سے راضی نہیں ہوگا بے شک ان فرائض کے سلسلہ میں جو اس نے عائد کئے ہیں اگر تکلیف ہو تو جتنی تکلیف ہوگی اتنا ہی اجر بھی بڑھ جائے گا مستقل طور سے صرف تکلیف ہی حاصل کرنا اپنے مدنظر نہ رکھئے اپنے مدنظر فرائض کا ادا کرنا ہی رکھئے" اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَحْمَزُهَا "سخت ترین عمل وہ ہے جو زیادہ تلخ ہو۔اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ کے لئے زیادہ تکلیف اختیار کیجئے، نہیں بلکہ ادائے فرض کے سلسلہ میں تکلیف اٹھانا پڑے تو فرض کو نہ چھوڑیئے، اس وقت معلوم ہوگا کہ آپ کی نظر میں فرض کہاں تک اہم ہے اس طرح نہ انسانی ضروریات زندگی کو نظر انداز کیا گیا، نہ آخرت کا خیال نظر انداز کیا گیا، فراہمی اموال بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام مال ودولت جمع کرنے کے منافی ہے، یعنی مال ودولت کی طرف توجہ ہی کو ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بے شک یہاں پر نقطہ خیال مختلف ہو گیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے دنیا میں ایسی سرمایہ داری کو اختیار کر لیا ہے جو اس وقت زیادہ طاقتور سلطنتوں میں پائی جاتی ہے کچھ لوگوں نے اس کے خلاف وہ مسلک اختیار کر لیا ہے جو اس وقت روس کی اشتراکیت میں ہے وہ کہتے ہیں مال ودولت کسی ایک کے پاس رہنا نہیں چاہیے۔ بلکہ مساوی حیثیت سے سب کے پاس ہونا چاہیے، زمین سب کی ہے، کوئی چیز کسی سے مخصوص نہیں رہنا چاہیے، بعض لوگ جنہوں نے اسلامی تعلیمات کا پورے طور سے مطالعہ نہیں کیا

ہے وہ روس کی اشتراکیت کو اسلام کے سر منڈھنا چاہتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ روس کی اشتراکیت اسلام کا حکم ہے۔

اس کے خلاف بعض لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو سرمایہ داری کا حامی جتلاتے ہیں، درحقیقت لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کی صحیح روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اسلام جس طرح ہر چیز میں ایک نقطہ اعتدال کو پیش کرتا ہے اور اسی میں اس کی حقیقی کامیابی کی روح مضمر ہے اسی طرح اس اشتراکیت اور سرمایہ داری میں وہ ایک نقطہ اعتدال کا حامل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اسلام اشتراکیت کا حامی ضرور ہے لیکن خود اختیارانہ اشتراکیت کا جبریہ اشتراکیت کا نہیں (ایک مختصر سا جملہ ہے جس کی تشریح بہت طویل ہے مگر مجھے اب وقت کم ہے) اسلام اشتراکیت کا حامی ضرور ہے اس کی توضیح مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ حضرت احدیت نے، دنیا کو عالم اسباب قرار دیا ہے اور اسباب کے اوپر نتائج کو مرتب قرار دیا ہے اسلام کی شریعت چونکہ قانون فطرت کی پابند ہے اس لئے اس نے بھی ہر شئے کے لئے کچھ اسباب مقرر کر دیے ہیں۔

اگر ایسے اسباب مجتمع ہو گئے تو شریعت اپنے قانون کے موافق ان نتائج کو مترتب کرے گی جو ان اسباب سے تعلق رکھتے ہیں، شریعت نے جس طرح ہر چیز کے لئے نتائج قرار دئے ہیں اسی طرح ملکیت کے لئے بھی کچھ اسباب قرار دئے ہیں۔

بے شک اس نے ہر شخص کو دعوت دی ہے کہ میدان عمل میں آ کر ایک دوسرے پر سبقت اختیار کرے۔ درحقیقت کامیابی کا جوہر مسابقت میں ہے، زندگی کا رمز ایک دوسرے کے آگے بڑھنے میں ظاہر ہوتا ہے اگر اس نے اپنی طرف چپہ چپہ برابر تقسیم کر دیا ہوتا تو پھر عمل کا میدان ہی کہاں رہتا، پھر سعی کی کوشش کے لئے وسعت ہی کہاں باقی رہتی۔ اس لئے اس نے مال و دولت کو تمام قیود سے آزاد، بغیر کسی مالک خاص کے اپنا قرار دیا یعنی جتنی دنیا کی چیزیں ہیں وہ ان تمام اسباب سے قطع نظر کر کے کس شخص کی ہیں؟ خدا کی "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ" زمین خدا کی ہے۔ دنیا میں جو کچھ مال ہے وہ سب خدا کا ہے، ہر چیز عالم کی صرف اس کی ذات سے مخصوص ہے، دولت خزانہ جتنی چیزیں ہیں وہ سب اسی کی ہیں۔

اس کے بعد اس نے موقع دیا اور اسباب قرار دئے کہ وہ چیزیں جو میری ہیں، دنیا کی

وسعت جو مجھ سے مخصوص ہے اس میں سب کا حق ہے اور کسی کا نہیں ہے۔ اس طرح اس نے دنیا کو موقع دیا آگے بڑھنے کا پھر اسباب مقرر کیے جن کے ذریعہ سے کوئی شئے کسی کی قرار پاسکتی ہے زمینیں ہیں وہ ان ذرائع سے ملکیت قرار پاسکتی ہیں کسی شخص کی، خزانے ہیں وہ اس طرح سے، درخت ہیں وہ اس طرح سے، شروع میں تو کسی کا کچھ بھی نہیں تھا اس کے بعد اسباب مقرر کیے گئے۔ اسباب میں کسی کا نام نہیں قرار دیا گیا کہ فلاں شخص کی یہ ملک ہوگی بلکہ جو اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان نتائج کو حاصل کر سکے جو قدرت نے ان اسباب کے لئے مقرر کئے ہیں اس طرح میدان عمل میں مسابقت کی دعوت دی کہ آو! اس میدانِ عمل میں اترو، اسباب موجود ہیں اسباب کے ذریعہ سے نتائج کو حاصل کرو۔

ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ وہ ہر چیز میں فرض شناسی کا لباس پہنا کر روحانیت کا لباس ضرور پہنا دیتا ہے۔ یہاں پر بھی درحقیقت مادیت نے روحانیت کا لباس پہن لیا، یہاں سے خداشناسی کا عنصر شریک ہوگیا۔ اب اگر کسی شخص نے افراد انسانی میں سے اپنی قوت عمل کو بیکار رکھا، معطل رکھا خدا کی دی ہوئی چیزوں سے فائدہ نہ اٹھایا اور دوسرے شخص نے عمل کیا، ان اسباب سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا، ان ذرائع عمل کو اختیار کیا جس کے ذریعہ سے مال و دولت بیشتر حاصل ہوتی ہو تو قدرت یہاں پر بے انصافی سمجھتی ہے کہ وہ برابر کر دے ان دونوں کو۔ اگر کسی شخص نے اس مال و دولت کو ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے تو بیشک اس کی ہر ایک چیز اس اصلی مالک کی ہے جس سے اس نے ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے لیکن اگر جائز ذریعہ سے کسی نے اپنے مال و دولت میں اضافہ کیا ہے اور دوسرے شخص نے ان ذرائع سے حاصل نہیں کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ قدرت گروں کو پکڑ کر ان کو مجبور کرے کہ اس کی تمام مال و دولت تقسیم ہو جائے دوسرے لوگوں میں جن کا اس عمل میں کوئی حصہ نہیں تھا لیکن ہاں! ان لوگوں کو مخاطب کر کے جنھوں نے مال و دولت حاصل کیا ہو ان کے اوپر ایسے احکام و فرائض عائد کر دئے کہ وہ خود بارادہ و اختیار خود اپنی خوشی سے ان لوگوں کی جو درحقیقت اپنی ذاتی کوتاہی سے یا اسباب کی کمی سے یا حوادث اتفاقیہ سے اس معیار بلندی پر نہیں آسکے اور فقر و فاقہ کی دشواریوں کو اٹھا رہے ہیں ان کی کفالت ہو سکے:-

الاغنیاء امنائی والفقراء عیالی۔

مال و دولت رکھنے والے ہمارے امانتدار ہیں اور فقیر ہمارے واجب النفقہ ہیں۔

اس طرح اشارہ کیا کہ اگر کسی نے کسی فقیر کی خبر گیری کی تو گویا اس نے ہمارے سوال کو پورا کیا، اس لئے کہ کسی کے واجب النفقہ کی آپ خبر گیری کر دیجئے تو گویا اس کو دے دیا۔

یہ ارشاد کیا!۔

''اے موسیٰ! اگر میں تمہارے دروازہ پر آؤں تو کیا دو گے؟''

موسیٰ کانپ گئے، جواب کیا دیں۔

ارشاد ہوا:۔ اگر کوئی فقیر تمہارے دروازے پر آئے تو سمجھو کہ میں آیا ہوں۔ اس طرح سے اغنیاء کے اموال میں فقیروں کو شریک قرار دیا لیکن یہ وہی شرکت خود اختیاری ہے اس طرح اس شخص کی محنت کا پھل بھی دے دیا جس نے اپنی ذاتی محنت و مشقت سے روپیہ کمایا تھا اور اس فقیر کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا، جو اس میدان عمل میں پیچھے رہ گیا تھا اس کے بعد زکوۃ و خمس کے احکام جاری کئے، یہ احکام ایسے ہیں کہ اگر ان پر صحیح طریقہ سے عمل ہوتا رہے تو مسلمانوں میں کوئی شخص بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہو لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اغنیاء اپنے فرائض کا احساس نہ کریں وہ خدا کی دیئے ہوئے مال و دولت کو اس طرح سمجھیں کہ گویا وہ کسی دوسرے محسن کے دست نگر نہیں ہیں، وہ بیکار کے مصارف میں کتنا ہی صرف کر دیں کتنا ہی زیادہ سے زیادہ مقدار میں دے دیں، بطور پیشکش کے بڑی بڑی ہستیوں کو کتنا ہی وہ اپنے خزانہ سے بھر دیں لیکن زکوۃ و خمس کے نام سے دینا نہیں نصیب ہوتا۔ وہ علم حساب حاصل کرتے ہیں مگر اپنی آمدنی اور صرف کے لئے نہیں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنی عمر بھر میں کتنا حاصل کیا، انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا تھا اس میں خدا کی طرف سے ہمارے اوپر کیا عائد ہوا تھا، وہ سرکاری حکام کے ٹیکسوں کو خوب ادا کرتے ہیں چاہے اس لئے کہ اس میں قرقی اور وارنٹ کا خوف ہے لیکن خدا کی طرف کا جو مطالبہ ہے اس پر نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ہم؟ ہماری زبانیں بھی خاموش یعنی وہ لوگ جو درحقیقت ان باتوں کی طرف متوجہ کرنے والے تھے، ان کی زبانوں پر قفل لگ گئے اس لئے کہ لوگوں کا خیال ہوگا یہ اپنے لئے کہتے ہیں۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ زکوۃ و خمس کے روپیہ کو

آپ کسی مجتہد کے سامنے پیش کریں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مجتہد مستحق کی شناخت میں آپ سے زیادہ ناواقف ہو، آپ کو ذاتی طور پر لوگوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ہے۔

مستحق وغیر مستحق سے بہ نسبت اس جماعت کے زیادہ واقف ہیں جو گوشہ گیر ہو، جو ظاہر پر عمل کرتی ہو، جس کے سامنے لوگ جا کر زیادہ پابندی مذہب کا اظہار کرتے ہوں، اس لئے کہ معلوم ہے کہ ملے گا تو یہیں سے ملے گا، بہت ممکن ہے کہ مستحق کی شناخت آپ کو زیادہ ہو۔ اس لئے زکوۃ وخمس کے احکام کو کتابوں میں دیکھ لیجئے، یا کسی مجتہد سے پوچھ لیجئے لیکن اس کے آپ کبھی منتظر نہ رہیے کہ ہم ان کے پاس پیش کریں بلکہ آپ اگر اپنے اور خدا کے درمیان اپنے ذاتی احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کو صحیح مستحقین تک پہنچا سکتے ہیں تو آپ اپنے ذمہ سے ادا ہو جائیں گے چاہے آپ کسی عالم دین کی صورت بھی نہ دیکھیں مگر زکوۃ وخمس ادا کیجئے، آپ شہر میں نہ دیجئے، بیرون شہر میں دیجئے، اگر چہ شہر کا حق مقدم ہوتا ہے لیکن بہر حال ادا تو کیجئے، ان ذمہ داریوں کا ہمارے سر عائد کیا جانا تو ہماری پریشانی کا سبب ہے۔

فطرہ کا روپیہ ہمارے پاس آتا ہے تو ہمارے لئے وبال جان ہو جاتا ہے اگر آپ کو اپنی نگاہ پر اعتماد ہے تو آپ ہی دیجئے لیکن خدا کا حکم ادا کیجئے، خدا کے فرض سے غافل نہ ہو جائیے، اگر آج اس پر عمل ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی لیکن وہ اشخاص جنہوں نے گداگری کو اپنا پیشہ بنالیا ہے وہ لوگ نظر قدرت میں ایک سخت معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں جو قریب ہے کفر کے ساتھ، جو قریب بہ شرک ہے، اس لئے کہ یہ خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں اگر وہ نماز کے پابند ہیں تو کہتے ہوں گے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ '' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے امداد طلب کرتے ہیں۔ لیکن گداگری سے ظاہر ہے کہ خدا پر بھروسہ نہیں ہے، دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں، سوال کرنا اسلام میں وہ چیز ہے کہ جس وقت مردار حلال ہوتا ہے اس وقت سوال کرنا جائز ہو سکتا ہے ورنہ گداگری اسلام میں جائز نہیں ہے۔

لیکن پھر بھی کیا کہنا اس کے تفضل کا، ایک طرف تو گداگری کو اتنی بڑی معصیت قرار دیا لیکن دوسری طرف اس کے لئے یہ حکم دیا کہ اب اگر اس نے معصیت کا ارتکاب کیا ہی ہے اب اگر اس نے معیار انسانی کو پست کر ہی دیا ہے تو تم انسانیت کو بدنام نہ کرو تم رد سوال نہ کرو۔ ایک

طرف اس کو روکتا ہے، خبردار! مانگنا نہیں، دوسری طرف آپ کو حکم دیتا ہے کہ خبردار! سوال رد نہ کرنا" اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ " سوال کرنے والے کو دور نہ کرو، اس کو جھڑکو نہیں۔

اس طرح سے نظام زندگی کا معیار قرار دیا اگر اس پر عمل ہو تو دنیا کہاں سے کہاں پہنچے لیکن عمل نہیں ہوتا بے شک یہ یاد رہے کہ اگر کسی موقع پر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے نہ دینے سے اور سوال کو پورا نہ کرنے سے عادت گدائی کی چھوٹے گی تو اس وقت آپ کو سوال کا رد کرنا مستحسن ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو رد سوال نہ کیجئے۔

عبادت کا صحیح مفہوم

تجارت اور کسب معیشت کی اہمیت

اسلام نے انسان کو عبادت کا جو حکم دیا ہے اس کے متعلق غلط فہمی ہے بعض اشخاص نے عبادت کی غرض غلط قرار دی، بعض لوگوں کو عبادت کے معنی سمجھنے میں یہ غلطی ہوئی ہے کہ عبادت صرف نماز و روزہ کا نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم یہ نہیں ہے، عبادت کا مفہوم ہے فرائض کا ادا کرنا، عبادت کے معنی ہیں خدا کی رضامندی حاصل کرنا، اپنے اعمال کے ذریعہ سے، اس میں تمام وہ شعبے زندگی کے داخل ہیں جن پر تمام انسانوں کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔

انفرادی افعال میں اجتماعی افعال میں، حق اللہ میں، حق الناس میں، ہر چیز میں انسان کا جو فرض ہے اس کو ادا کرنا یہ عبادت میں داخل ہے وہ چیز کہ جس کو بالکل ہی عبادت سے الگ سمجھا جاتا ہے یعنی مال و دولت کا حاصل کرنا، وہ بھی عبادت کا ایک جز ہے حلال طریقہ سے مال و دولت کا حاصل کرنا ہرگز دین سے الگ نہیں ہے۔

"تجارت اور اسلام" کے سلسلہ میں بیان کر چکا ہوں کہ جناب رسالت مآبؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک جوان خوش شکل و شمائل ادھر سے ہو کر گذرا اصحاب کرام نے یہ کہا "افسوس اس کی جوانی پر، کاش یہ جوانی عبادت خدا میں صرف ہوتی" جناب رسالت مآبؐ نے سنا تو فرمایا" کیا کہا تم نے؟" انہوں نے کہا کہ "ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جوان اپنی جوانی کو گذار رہا ہے طلب دنیا میں کاش احکام کے پورا کرنے اور عبادت میں گذارتا"

آپؑ نے فرمایا ''یہ تم نے کیونکر کہہ دیا کہ اس کی جوانی راہ خدا میں صرف نہیں ہو رہی ہے اگر اس کا مال دنیا طلب کرنا اس لئے ہے کہ اپنے اہل وعیال کے رزق کی کشائش کر سکے اور ان کے لئے سامان راحت مہیا کرے تو وہ خدا کی راہ میں ہے عبادت میں مصروف ہے اگر اس لئے مال و دولت حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حج کرے، صدقہ عطا کرے تب بھی وہ خدا کی راہ میں ہے''۔

ہاں! بے شک اگر مال و دولت کو صرف اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اپنے ابنائے جنس میں تفوق حاصل کرے تب بے شک شیطان کے راستہ میں ہے، تو انسان اگر مال و دولت کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ امور خیر کا انصرام کر سکے تو کون کہتا ہے کہ وہ عبادت سے الگ ہے؟

تجارت وہ چیز ہے جسے انبیاء و مرسلین نے کیا لیکن ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم نے تجارت کو اپنے لئے سبب توہین سمجھ لیا ہم نے اپنے لئے سبب حقارت وذلت سمجھ لیا ہے۔

ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کبھی تجارت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ یہ اشتہار شائع کرتا ہے کہ گردش زمانہ سے اب شیعوں کی یہ حالت پہنچی ہے کہ وہ تجارت کر رہے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ تجارت عار و ننگ ہے، تجارت گداگری سے بھی بڑھ کر ہے، گردش زمانہ سے اب یہ حالت پہنچی ہے، یاد رکھئے کہ جس کام کو آپ ذلت سمجھ کر اختیار کریں گے دنیا حق رکھتی ہے کہ اس پر آپ کو حقارت کی نظر سے دیکھے، اگر گردش زمانہ سے یہ وقت آیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ گردش زمانہ سے ہماری زندگی کا دور آیا ہے، ہماری کامیابی کا سلسلہ شروع ہوا ہے لیکن کوئی کام اس طرح سے نہیں ہوتا جس طرح سے ہم کرتے ہیں، آپ نے تجارتیں کرنا شروع کیں تو اس کو ایک غیر معمولی صورت سے شروع کیا، علماء کو بلا کر دکانوں کا افتتاح کرایا، اشتہار شائع کیا کہ شیعوں کو قومی حیثیت سے تجارت کی ضرورت ہے اس لئے ہم نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا، فلاں شخص نے اپنے مواعظ میں چونکہ تجارت پر ترغیب دلائی تھی اس کے مواعظ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم اس دکان کا افتتاح کر رہے ہیں۔

بندہ پرور اس طرح سے تجارت نہیں ہوتی، آپ کیوں ڈرتے ہیں، آپ کوئی کام شروع

کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے مواعظ سے مجبور ہو کر میں اس کو شروع کرتا ہوں، آپ کیوں یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ ہم ضروریات زندگی سے مجبور ہو کر تجارت کرتے ہیں کیوں نہیں کہتے کہ "ہماری زندگی موقوف ہے تجارت پر اس لیے تجارت کرتے ہیں" آپ تاجر بننا چاہتے ہیں تو مصلح کی شکل کیوں اختیار کرتے ہیں، آپ تجارت کیجئے دکانداروں کی شکل میں، اس کو کوئی دوسرا لباس نہ پہنائیے، پھر بھی اچھا ہے یوں ہی رفتہ رفتہ افراد قوم کی ذہنیت میں تبدیلی ہو گی، اگر چہ آگے بڑھنے والے بہت آگے بڑھ گئے لیکن ایک جگہ ٹھہرنے سے آگے بڑھنا پھر بھی بہتر ہے۔

اجتماعی زندگی کے مختلف پہلو

اس کے بعد اجتماعی زندگی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ایک گھر کے رہنے والوں کی زندگی، ایک شہر کے رہنے والوں کی، ایک ملک کے رہنے والوں کی اس کے بعد تمام دنیا کے رہنے والوں کی زندگی، اسلام نے کسی جز کو حیات کی تجزیٔ تعلیمات نہیں چھوڑا۔ ہر شعبہ میں حیات کے اپنے علمی اور عملی نقش قائم کر دیے ہیں جس پر عمل کرنا صحیح طور پر کامیابی کا ذمہ دار ہے، تدبیر منزل سیاست مدن، کیا کہنا اسلامی قانون کی جامعیت کا! علمائے علم اخلاق کو اس باب میں کہنا پڑتا ہے کہ کیا کریں شریعت اسلام نے ضروریات کو پورا کر دیا، ایک کتاب فقہ کی جو احکام اسلام کی جامع ہے وہی علم اخلاق کی جامع ہے جتنے دنیا کے شعبے ہیں سب شریعت اسلام کے اندر مکمل طور سے موجود ہیں کس طرح سے اولاد کی تربیت کرنا چاہیے۔

ارشاد ہوتا ہے جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا سے نسبت رکھتا ہے ہر شخص کو اپنے گھر میں اپنی ذات میں وہی نسبت حاصل ہے، کوئی شخص اپنے تئیں ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھے "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ" "ہر شخص تم میں سے نگراں ہے اور ہر شخص تم میں سے جواب دہ ہے، باپ کے مقابلہ میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، باپ کو اولاد کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، زوجہ کو شوہر اور شوہر کو زوجہ کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اس بات کو شریعت اسلام نے اس طرح سے پیش کیا کہ در حقیقت اس سے بہتر تعلیم دنیا میں ہو نہیں سکتی، تمام نظام عالم آپس کے سلسلہ احتیاج پر قائم ہے۔ یہ ایک مختصر سا جملہ ہے بے شک تمام نظام علم سلسلہ

احتیاج پر قائم ہے لیکن اگر سلسلہ احتیاج یک طرفہ ہو تو نظام عالم معطل ہو جائے، قدرت نے نظام دنیا کو اس طرح سے قائم کیا ہے کہ ہر شخص محتاج ہے، اور ہر شخص محتاج الیہ ہے۔ جب اس طرح سے تمام کڑیاں آپس میں جڑیں گی، اس وقت نظام عالم برقرار رہے گا اس لئے تقسیم عمل کا اصول نافذ کیا گیا کہ تقسیم عمل کے ذریعہ سے ہر شخص دوسرے کا محتاج الیہ بن جائے۔

تمام نظام عالم کی کڑیاں اس سے مضبوط ہوئی ہیں، اسی سے یہ کثرت وحدت کا لباس پہنتی ہے، کوئی مرکب اس وقت تک عالم ترکیب میں رہ نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اجزا ایک دوسرے کی طرف احتیاج نہ رکھتے ہوں، دنیا کا انتظام، ملک کا انتظام اسی طرح گھر کا انتظام اگر تمام عنصر جو گھر میں قدرت نے ودیعت کئے ہیں یہ عناصر ایک دوسرے کی طرف محتاج نہ ہوں تو درحقیقت یہ نظام درست نہیں ہو سکتا، اس لئے قدرت نے ان کے درمیان میں تقسیم عمل کیا چونکہ وہ شریعت بیکار ہے جو فطرت کے مطابق نہ ہو اس لئے انسان کی فطرت کو دیکھا کہ باہر کے لئے کون مناسب ہو سکتا ہے اور اندر کے کون لائق تقسیم عمل کے اصول پر نظم قائم کیا، اور فرائض کو دو شعبوں میں تقسیم کیا، امور داخلی، اور امور خارجی، امور داخلی کا انتظام گھر کی ملکہ کے سپرد کیا اور امور خارجی کا انصرام مرد کے حوالہ۔

کون کہتا ہے کہ اسلام نے عورت کا معیار پست مقرر کیا کون کہتا ہے کہ اسلام نے عورت کو ذلت کی نظر سے دیکھا، اسلام نے مرد کو کارکن قرار دیا، عورت کو ملکہ بنایا، مرد کو مزدور اور عورت کو سرمایہ دار قرار دیا مرد کو حوادث دنیا کے تھپیڑوں میں ڈال دیا، مرد کے قوائے عمل کا اندازہ کیا اس نے اس کی بنیاد جسمانی کو پہلے سے اس کے مطابق قرار دیا تھا کہ دنیا کے بیرونی مشکلات کا مقابلہ کرے یہ سب کچھ مرد کے لئے چھوڑا، وہ باریک کام گھر کا وہ جس میں قوت شعور وخیال کی ضرورت ہے اس کو عورت کے سپرد کیا۔ اور مرد کو باہر کے لئے قرار دیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت گھر میں بیٹھی ہوئی کام کرتی رہے مرد کام کرتا رہے، وہ جو کچھ حاصل کرے لا کر اس کے پاس ڈال دے اس مال ودولت کو یہ صَرف کرے اور اس کا انتظام درست رکھے، اس طرح سے اس نے انتظام قائم کیا گھر کا، اس طرح خانہ داری کے اصول کی تعلیم دی، آج آپ جایئے دنیائے متمدن میں دیکھئے سب کچھ ہے کونسلوں میں عورتیں پہنچ گئی ہیں، اداروں میں اور دفتروں میں

موجود ہیں لیکن انتظام خانہ داری درست نہیں ہے؟

لوگوں نے گھر کو بگاڑ کر جنگل کو آباد کیا، خود برباد ہوئے دوسروں کی خانہ آبادی کر دی، لیکن اسلام نے آپ کے سامنے کیا قانون پیش کیا تھا اور ہر مرد کی فوقیت عورت پر ثابت کی کہ اگر ہم نے اسے کارکن قرار دیا ہے تو مزدوری نہ سمجھ لینا "اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" مرد صاحب اختیار قرار دیا گیا ہے عورت پر۔

اس طرح اس کے معیار کو بلند کیا، عورت کے معیار کو لطف و رحمت کے پہلو کو آگے بڑھا کر بلند کیا، فرماتے ہیں:۔

"اَلْمَرْأَةُ رَيْحَانَةٌ" عورت گلدستہ ہے۔ عورت گلاب کا پھول ہے پھر گلاب کے پھول کو جتنے ملائم ہاتھوں سے رکھ سکتے ہو جتنا ملائم سلوک کر سکتے ہو اختیار کرو، اس کے بعد میں کہاں تک اس موضوع کو بیان کر سکتا ہوں اس لئے کہ بیان کی مسافت ختم ہو چکی ہے۔

گھر میں ماں اور بیٹا ہے، بیٹے کے لئے ماں کی اطاعت قرار دی جس طرح باپ کی اطاعت قرار دی، یہ کہا کہ جنت ماں کے پیروں کے نیچے ہے۔ یہاں تک معیار بلند کیا کہ اگر کسی حکم الہی سے جو بحد وجوب نہ ہو تصادم ہو جائے والدین کے حکم کا تو وہ امر مستحب حرمت کا لباس پہن لے گا یعنی بہتر سے بہتر عمل صالح، نوافل نماز، حج مستحب، زیارت، کو ماں نے منع کر دیا بس اب ناجائز ہے حرام ہے وہاں تک کہ جہاں تک باپ کے سامنے حکم ہے سرنگوں ہونے کے، ماں کے سامنے بھی حکم ہے "لَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا" اس طرح دونوں کے معیار کو ایک رکھا گیا۔

بیشک جب خدا کے حکم کے مقابلہ میں والدین آئیں اس وقت کے لئے ارشاد ہوا "وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا"

اگر یہ لوگ تم سے اس بات کے طالب ہوں کہ تم خدا کے ساتھ شرک کرو، تو پھر ان کی اطاعت نہ کرنا۔

اولاد جب تک صغیر السن ہے اس کے حقوق والدین پر قرار دیے گئے لیکن جب بچہ سن تمیز کو پہنچ گیا اور بیٹا قابل اس کے ہوا کہ وہ کسب معیشت کر سکے، اب باپ پر اس کی ذمہ داری نہیں رہی، بیشک باپ پر جو ذمہ داری تھی وہ تربیت کی تھی لیکن جب وہ تربیت کر چکا تو اب بیٹے کا کوئی

فرض باپ پر نہیں رہا،لڑکی بے شک جس وقت تک شادی نہ ہواس وقت تک اس کا فرض باپ کے ذمہ ہے لیکن جب شادی کردی تو اب وہ دوسرے گھر کے انتظام سے متعلق ہوگئی اب اس کا رابطہ اس پہلے گھر سے منقطع ہوگیا اب اس کے کچھ حقوق نہیں ، ہاں باپ کی میراث میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے لیکن افسوس کہ پنجاب وغیرہ میں اور خود یہاں کے دیہاتوں میں مسلماں نے مثل ہندووں کے لڑکی کا حصہ ہی میراث سے ختم کردیا ہے یہ بالکل شریعت اسلام کے خلاف ہے۔

نظامِ اجتماعی یعنی عام سیاست تمدنی

اسلام نے دنیا کے لئے یہ نظام قرار دیا کہ ہر شخص دوسرے کا احترام کرے ،در حقیقت آپس میں فسادات ہوتے ہیں اس وجہ سے کہ ایک دوسرے کو اپنے سے کم سمجھتا ہے، اسلام کا یہ قانون ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ اپنے کو دوسرے سے بہتر سمجھے !۔

لَا یَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُنَّ خَیۡرًا مِّنۡہُنَّ

ہرگز ایک قوم دوسری قوم کا تمسخر نہ کرے ۔ممکن ہے کہ وہ تم سے اچھے ہوں ،اور نہ کوئی عورت دوسری عورت کا تمسخر کرے، ممکن ہے کہ اس کا مرتبہ بلند ہو۔

حدیث میں ارشاد کیا گیا دیکھو! بڑوں کو چاہیے کہ چھوٹوں کی عزت کریں ، کیوں؟ اس لئے کہ عمران کی کم ہے ،انہوں نے گناہ تم سے کم کیے ہوں گے اور چھوٹوں کو چاہیے کہ وہ بڑوں کی تعظیم کریں اس لئے کہ ان کی عمر زیادہ ہے انہوں نے اطاعت تم سے زیادہ کی ہوگی ۔اور دیکھو! برابر والوں کو چاہیے کہ وہ برابر والوں کی عزت کریں اس لئے کہ تمہارے گناہ تمہارے لئے یقینی ہیں لیکن دوسروں کے گناہ تمہارے لئے یقینی نہیں ہیں ۔کیا اس پر عمل ہو تو دنیا میں کوئی منافرت باقی رہ سکتی ہے؟

میں نے سابق میں عرض کیا ہے کہ اسلام نے ان امتیازات کو مٹا کر جو عام افراد نے اپنے نظریوں کے مطابق دے لئے تھے ایک دائرہ مساوات قائم کیا، اسلام ہی وہ ایک واحد مذہب ہے جس میں شاہ وگدا مساوی حیثیت رکھتے ہیں ، مذہبی حیثیت سے ایک بادشاہ کو اپنے

ایک معمولی سپاہی پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے اس میں اگر تفوق بھی قرار دیا گیا ہے تو روحانی اعتبار سے قرار دیا گیا ہے۔

نماز جماعت میں یہ حکم ضرور قرار دیا گیا ہے کہ امام کے بعد پہلی صف میں صاحبان تقویٰ، وہ نیک اعمال والے لوگ ہوں جن میں ہر ایک حق رکھتا ہو امام جماعت ہونے کا، ہمارے یہاں تنظیم نہیں ہے اس لئے نماز جماعت کی ترتیب بھی درست نہیں ہے، امام کے بعد پہلی صف میں اس سے متصل ایسے افراد ہونا چاہئیں جن میں سے ہر ایک نماز جماعت پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو، تاکہ اگر امام کسی وجہ سے قاصر ہو جائے نماز ادا کرنے میں تو ان میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر مصلی پر پہنچ کر نماز کو تمام کرے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی تفوق قرار نہیں دیا گیا ہے یہ نہیں ہے کہ مالدار پہلی صف میں ہوں فقیر دوسری صف میں معززین آگے ہیں گمنام افراد پیچھے۔

ایسا کوئی تفوق نہیں ہے سب مساوی ہیں ایک فقیر پہلی صف میں ہو، اور ایک امیر دوسری صف میں ہو، تو اس امیر کا سر اس فقیر کے پیروں کے پاس ہوگا، یہ خصوصیت بھی اسلام سے مخصوص ہے وہ جنہوں نے دائرہ اسلام میں قدم رکھا، خواہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں جب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تو ان کے حقوق مساوی ہو گئے اور ان تمام افراد کے ساتھ جو پہلے سے اسلام میں تھے کوئی تفریق نہیں ہے، پست سے پست افراد جن کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اگر مسلمان ہو جائیں تو ان کے حقوق مساوی ہیں یہ بھی دوسروں کو دیکھ کر ہم نے تقلید کی ہے میں نے سنا ہے کہ بہت سے وہ (ہمارے محاورہ میں پست اور نیچ ذات کے) لوگ (نیچ ذات تو ہم نے بنا دیا) نیچ ذات جنہیں مہتر کہتے ہیں وہ اگر مسلمان ہو جاتے ہیں تو بہت سے افراد اہل اسلام ان کے پاس بیٹھنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

یہ اسلام کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے، یہ وہ چیز ہے جس کو ہم نے دوسروں کو دیکھ کر اختیار کر لیا ہے، اگر آپ دول اسلامیہ میں جہاں خو بو اصل اسلام کی باقی ہے جہاں دوسروں کی ہمسائیگی نے ہمارے اخلاق کو تبدیل نہیں کیا ہے جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بالوعہ صاف کرنے والے لوگ دن میں بالوعہ صاف کرتے ہیں اور سر سے پاؤں تک نجاستوں میں لت پت ہوتے ہیں لیکن ادھر غسل کیا صاف کپڑے پہنے اور جا کر نماز جماعت میں شریک ہو گئے۔ چاہے

پہلی صف ہو، آخر صف ہو۔ ان کو کوئی منع کرنے والا نہیں ہے کہ تم آ کر علماء کے ساتھ کیوں بیٹھے ہو؟ ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ تم ہمارے قریب نہ بیٹھنا بالکل مساوات کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم، یہ ہے اسلام کی ہدایت، وہ بھی در حقیقت ایک رکن ہیں اس نظام حیات کا، جس پر دنیا قائم ہے، در حقیقت آپ ان کے بھی دست نگر ہیں، ممنون احسان ہیں اگر کوئی آپ کے بہت سی ضروریات پورے کرتا ہو تو اس کو ذلیل نظروں سے نہ دیکھئے اگر ان لوگوں کا وجود نہ ہو تو آپ کی حیات قائم نہیں رہ سکتی، تمام افراد انسان مثل اعضائے بشری کے ہیں تمام افراد ایک جسم کے اعضاء ہیں ان اعضاء میں جس طرح سے قدرت نے تقسیم عمل کیا ہے ہاتھ ہیں پیر ہیں، آنکھیں ہیں، ہر ایک کے فرائض الگ الگ ہیں ہر ایک کی منزل الگ الگ ہے، نظام زندگی کے اعتبار سے ہر ایک کا کام اس کے ذمہ ہے دوسرا اس میں مزاحمت نہیں کرتا کوئی ایک عضو انسان کا دوسرے کو ذلیل نظر سے دیکھنے کا حقدار نہیں ہے، پاوں میں لگا ہوا کانٹا ہاتھ ہی سے نکلے گا، ہاتھ بلند ضرور ہے لیکن ضرورت پڑے گی تو ہاتھ کا کام پاوں سے اور پاوں کا کام ہاتھ سے نکلے گا اتحادِ عمل ہے شیرازہ اجتماعی یوں منظم ہوتا ہے۔

اسی طرح سے یہ تمام شعبے جو انسانی زندگی کے ہیں، اس کی تقسیم ضرور ہے کسی سے کوئی کام متعلق ہے اور کسی سے کوئی کام، لیکن کسی کو اس کے پیشہ کی وجہ سے ذلیل نظر سے نہ دیکھئے جس طرح سے بہت سی باتوں میں وہ آپ کے دست نگر ہیں اسی طرح سے بہت سے کاموں میں آپ ان کے دست نگر ہیں، تو آپ کو کیا حق ہے اس کا کہ آپ حقارت سے دیکھئے ان کو آپ نگاہِ ذلت سے دیکھئے۔ کسی پیشہ والے کو ذلت سے دیکھنے کا حق آپ کو اسلام کی طرف سے نہیں ہے۔ اصحاب ائمہ کیسے کیسے افراد تھے یہ اصحاب ائمہ کوئی معمولی ہستیاں نہیں ہیں، یہ وہ ہیں کہ احکام شرعیہ انہی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچے ہیں، در حقیقت وہی فقہا تھے حرام حلال جاننے والے، ہم کو تو سنائے انہی کے ذریعہ سے فیوض پہنچے ہیں جو ائمہ کی طرف سے ان کو پہنچے تھے لیکن اگر آپ دیکھئے تو آپ کو ملے گا کتب رجال میں "جمال اونٹ چلانے والا" کسی کے نام کے ساتھ آپ کو ملے گا "تمار" کسی کے نام کے ساتھ "بزاز" کسی کے نام کے ساتھ ملے گا "دہان" جس کو آپ اپنے پست الفاظ میں "تیلی" کہتے ہیں کسی کے نام کے ساتھ ملے گا "طحان، آٹا بیچنے والا" کسی کے نام

کے ساتھ ملے گا۔ ''بقال'' یعنی سبزی بیچنے والا۔ اس طرح مختلف افراد کے ساتھ آپ کو مختلف نام ملیں گے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ دن بھر دوکان پر بیٹھتے تھے کسب معیشت کرتے تھے جس وقت فرصت ہوتی تھی جا کر علوم ائمہ کو حاصل کرتے تھے یہی افراد ہیں جن کی عملی سیرت ہمارے لئے قابل قدر ہے، قابل پیروی ہے، ائمہ نے ان کو احکام تفویض کئے، اگر کسی نے تجارت کو چھوڑ دیا، پوچھا کیوں چھوڑ دیا، ضرور تجارت شروع کرو۔

اس لئے کہ باز رہنا تجارت سے اور ترک کرنا عمل شیطان سے ہے۔ تو ایک مساوات قائم ہے کسی کو اس کے پیشہ کی جہت سے ذلیل نظر سے نہ دیکھئے کوئی اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں بڑا متقی پرہیزگار نہ سمجھے بے شک ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ'' ''تم میں سب سے زیادہ معزز ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک شخص جو معاصی سے پرہیز کرتا ہے دوسروں کو اپنے مقابلہ میں حقیر نظر سے دیکھے کہ میں اس سے زیادہ متقی ہوں وہ تقویٰ اس کے لئے وبال اخروی کا سبب بن جائے گا۔

یہ تو قدرت کی نظر میں ہے کہ جو متقی ہوگا وہ معزز ہوگا مگر کسی انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کو متقی سمجھ کر دوسروں کو حقارت سے دیکھے، اس لئے کہ باطن کا علم خدا کو ہے۔

آپ اس بات پر نہ جائیے کہ میں نے بہت نمازیں پڑھی ہیں روزے رکھے ہیں، دوسروں سے اپنے کو بہتر سمجھوں، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص مجھ سے بہتر ہے اگر ایسا جذبہ پیدا ہو جائے تو در حقیقت گھمنڈ اور غرور کا وجود دنیا میں نہ رہ جائے ''لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ'' ''کوئی جماعت دوسری جماعت کا تمسخر نہ کرے۔ مذاق اور چیز ہے تمسخر اور چیز ہے، فرق یہ ہے کہ مذاق میں کسی کی اہانت منظور نہیں ہوتی، مسخرہ بنانے میں اہانت شریک ہوتی ہے، مذاق حد جائز میں ہو تو مزاح میں داخل ہے ''مزاح المومنین خیر'' لیکن وہاں تک کہ حد اعتدال میں رہے تمسخر وہ ہے جس کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کا تمسخر نہ کرے۔ آپ کو کیا معلوم شاید وہ آپ سے بہتر ہو۔

وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ۔

اور نہ عورتوں کو حق ہے کہ وہ دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیا معلوم وہ بہتر ہوں ان

سے عمل میں ''وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ'' اور مختلف القاب نہ رکھو لو پکارنے کے لئے، جیسے اکثر دوسروں پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں نام ایسے رکھتے ہیں جو برے معلوم ہونے کے قابل ہوں، ایسا نہ کرو میں نے عرض کیا کہ معصوم نے تعلیم دی بڑے چھوٹوں کو اپنے سے بہتر سمجھیں چھوٹے بڑوں کو بہتر سمجھیں، برابر والے برابر والوں کو اپنے سے بہتر سمجھیں اگر یہ چیز پیدا ہو جائے تو پھر دنیا میں تنافر باہمی کا پتہ نہ رہے شکوہ وشکایت کا وجود نہ رہے، یہ کیا ہے کہ ہمارے کسی مزعومہ معیار عظمت میں کمی ہوئی اور ہماری تیوریوں پر بل آگئے، چاہے دوسروں کے حق میں ہم نے کتنی ہی فروگذاشت کی ہو مگر ہماری تعظیم کے لئے اگر کوئی نصف قد سے کھڑا ہو تو برا معلوم ہوگا، مگر خود ہم نے اپنے طرز عمل کا جائزہ کبھی نہیں لیا کہ ہم تو کبھی کسی کے ساتھ کمی نہیں کرتے؟

امیر المومنین نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

اِجْعَلْ نَفْسَكَ مِيزَانًا فِيمَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ غَيْرِكَ.

اپنے نفسوں کو معیار قرار دو اپنے اور اپنے غیر کے درمیان۔

اپنے نفس کو ترازو بناو، اپنے اور غیر کے معاملات میں۔

فَأَحْبِبْ لِغَيْرِكَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ

غیر کے لئے اسی بات کو محبوب سمجھو جس کو اپنے نفس کے لئے محبوب سمجھتے ہو۔

وَاكْرَهْ لَهُ مَا تَكْرَهُ لَهَا

اور ناگوار سمجھو غیر کے لئے جس کو اپنے لئے ناگوار سمجھتے ہو۔

وَلَا تَظْلِمْ كَمَا لَا تُحِبُّ أَنْ تُظْلَمَ

دوسروں پر ظلم نہ کرو جس طرح یہ نہیں چاہتے کہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

وَأَحْسِنْ كَمَا تُحِبُّ أَنْ يُحْسَنَ إِلَيْكَ

دوسروں کے ساتھ اچھائی کرو جس طرح چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھائی کریں۔

وَاسْتَقْبِحْ مِنْ نَفْسِكَ مَا تَسْتَقْبِحُ مِنْ غَيْرِكَ

جس چیز کو غیر کے لئے معیوب سمجھتے ہو اسے اپنے لئے بھی معیوب خیال کرو۔

وَارْضَ مِنَ النَّاسِ بِمَا تَرْضَاهُ لَهُمْ مِنْ نَفْسِكَ

دوسروں سے اپنے لئے اتنے ہی طرز عمل پر راضی ہوجاو، جتنے طرز عمل پر تم غیر کے ساتھ اپنی طرف سے راضی ہوتے ہو، یعنی خود جتنا برتاو غیر کے ساتھ کر سکتے ہو اور کافی سمجھتے ہو اتنے ہی کو کافی سمجھو غیر کی طرف سے اپنے لئے، یہ تعلیم ہمارے سامنے موجود ہے مگر ہم کو کبھی توجہ نہیں ہوتی کہ ہم اپنے اعمال وافعال کو پرکھیں کہ کہاں تک وہ معیار صحیح پر ہیں، ہماری نظر دوسروں کے افعال پر بہت جلد پڑتی ہے کبھی ہمیں اس امر پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ کہیں ہمارے طرز عمل میں تو وہ قابل اعتراض چیز نہیں پائی جاتی اگر انسان اپنے نفس پر توجہ کرے تو اس کی نظر غیر پر جائے ہی کیوں؟ اسے اپنے ہی سے فرصت نہ ملے۔

مومن کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

نَفْسُهُ مِنْهُ فِي عَنَاءٍ وَالنَّاسُ مِنْهُ فِي رَاحَةٍ.

دنیا اس کی طرف سے چین اور آرام میں ہے مگر اس کا نفس کو دایک شکنجہ میں مبتلا ہے۔

وزنوا أنفسكم قبل أن توزنوا.

تولو اپنے نفس کو قبل اس کے کہ تولنے کا وقت آئے۔

لیکن ہمارا تو یہ کام ہے کہ ہم کسی جگہ بیٹھیں تو یہ نقل محفل ہے کہ دوسروں پر اعتراض کریں دوسروں کی اچھائیوں سے چشم پوشی کرنا اور دوسروں کی برائیوں کو نمایاں کرنا، یہ چیزیں وہ ہیں جن سے ہیئت اجتماعی میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ اسلام نے اس کو منع کیا ہے:۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ.

کبھی تم میں سے کوئی دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے کی جرات نہ کرے، کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاو۔

جیسے کوئی مردہ ہو اس کو خبر نہیں اگر اس کا گوشت کوئی کھائے ویسے ہی کسی کی غیبت میں برائی کرنا، ایک دوسرے کی دل آزاری کرنا، ایک دوسرے کا دل دکھانا، اس کو بڑی معصیت قرار دیا:۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا.

وہ لوگ جو ایک دوسرے کو اذیت دیتے ہیں ناحق انہوں نے بڑی معصیت کا ارتکاب کیا۔
خدا کی طرف سے اس کو "اثم مبین" یعنی کھلا ہوا گناہ کہا جارہا ہے کہا: مومن کا دل ہماری جائے نزول اجلال ہے، اگر مومن کے دل کو تکلیف پہنچی تو اس سے مجھ کو تکلیف ہوگی، مومن کے دل کو اپنی فرودگاہ بتایا۔

فرمایا:۔

لَا يَسَعُنِي أَرْضِي وَلَا سَمَائِي وَلَكِنْ يَسَعُنِي قَلْبُ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ.

ارض وسما میرے لئے وسعت نہیں ہے مگر مومن کے دل میں میرے لئے وسعت ہے۔

یہ آپس کے اختلافات کا سدباب کرنا تھا۔

امیرالمومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں:۔

تَلَافِيكَ مَا فَرَطَ مِنْ صَمْتِكَ أَيْسَرُ مِنْ إِدْرَاكِكَ مَا فَاتَ مِنْ مَنْطِقِكَ.

خاموش رہنے میں اگر کوئی مقصد فوت ہوتا ہے تو اس کا تدارک آسان ہے اس خرابی کے تدارک سے جو بات کہ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ زبان آگ، اس کو کسی ایسے کلمہ سے جو کسی دوسرے کے دل میں ٹھیس لگنے کا باعث ہو، انسان روکے رہے تو کاہے کو دنیا میں منافرت پیدا ہو، ایک طرف یہ ممانعت کہ خبردار! تمہاری طرف سے کسی کا دل نہ دکھنے پائے، کسی کو ایذا نہ پہنچنے پائے، ایک طرف یہ حکم کہ کسی کی حاجت کو پورا کردینا ستر برس کی عبادت کے برابر ہے آپس میں ایک دوسرے کی خدمت کرنا یہ وہ چیز ہے جو بہتر سے بہتر عبادت قرار دے دی گئی ہے۔

امام طواف میں مصروف تھے ایک شخص آتا ہے اور کچھ عرض کرتا ہے آپ طواف کو قطع کرکے اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں واپس آنے پر طواف کو پورا کرتے ہیں۔

ایک دوسرا شخص پوچھتا کہ آپ نے طواف تمام نہیں فرمایا، فرماتے ہیں ایک بندہ مومن کی ایک حاجت تھی مجھ کو اچھا معلوم ہوا کہ طواف سے قبل اس کی حاجت پوری کردوں۔

مگر ہم کو تو اس سے مطلب ہے کہ ہمارے لئے راحت و آرام ہو، دوسرے چاہے مشقت میں بسر کریں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام افراد بمنزلہ فرد واحد کے ہیں، انسان کے تمام

اعضاء وجوارح رعایا ہیں دل متمکن کیا گیا ہے عرش حکومت پر، اس جسم کی مختصر مملکت میں تمام اعضاء وجوارح اس کے تابع فرمان ہیں، ذرا نگاہ ڈالئے اعضاء کے باہمی ارتباط پر، ایک کانٹا اگر کسی پاوں کے انگوٹھے میں لگتا ہے تو تمام اعضاء بے چین ہوجاتے ہیں۔

یہی پھر کیوں نہیں ہوتا کہ اگر ایک پر کوئی مصیبت پڑے تو نوع بشری پر اثر ہوجائے، اسلام نے یہی تعلیم دی کہ در حقیقت دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھو، دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھو اپنی حاجت کو روک دو، دوسرے کی حاجت کو پورا کر!۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ.

مقدم کرتے ہیں دوسروں کو اپنے نفس پر، اگر چہ خود اپنے کو ضرورت ہو۔

یہ ایثار یعنی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرنا، یہی وہ خاص چیز ہے جو اسلامی تعلیم کا زیور ہے، جب نقش اسلام تازہ تھا گرد وغبار نہیں آنے پایا تھا مسلمانوں کے طرز عمل میں اس تعلیم کے نمونے پائے جاتے ہیں جو رسولؐ اور آل رسولؐ کی طرف سے ملی تھی، جنگ یرموک کا واقعہ تاریخوں میں درج ہے مسلمانوں کے لشکر میں کوئی آدمی زخمی ہوکر گرا ہے پیاس کا غلبہ ہے، ایک شخص کسی اپنے عزیز کے لئے پانی لے کر پلانے جاتا ہے ایک دوسرا زخمی پانی کی طرف دیکھنے لگتا ہے وہ پہلا کہتا ہے کہ پہلے اسے پانی پلاو، یہ اس کی طرف پانی لے کر جاتا ہے تو تیسرا زخمی نظر پڑ جاتا ہے اس کی نظر بھی اسی جام آب پر ہے، دوسرا کہتا ہے کہ پہلے اس کو پانی پلا دو، اسی طرح چار آدمی پڑے ہوئے ملتے ہیں جب چوتھے کے پاس پہنچتا ہے تو اس کی روح مفارقت کر جاتی ہے، تیسرے کے پاس آتا ہے وہ بھی اپنی جان دے چکتا ہے دوسرے کے پاس آیا اس کا بھی جسم سرد ہو چکا تھا اور اسی طرح پہلا شخص بھی تشنہ لب دنیا سے رخصت ہوگیا۔

یہ مسلمانوں کا وہ طرز عمل ہے جو تازہ تازہ ان میں موجود تھا جس پر ابھی مادیت کا گرد و غبار نہیں پڑا تھا جس پر امتداد زمانہ نے غفلت کے پردے نہیں ڈال دیئے تھے۔

اب ہم میں سے کتنے افراد ہوں گے جو اس طرز عمل کے پابند ہوسکیں گے ہمارے یہاں تو یہ ہے کہ کسی ایسے سخت موقع کا ذکر نہیں جب کوئی دشواری نہ ہو، کوئی شدت نہ ہو، ہم چاہتے ہیں کہ چاہے دوسرے کا گلا کٹ جائے مگر ہم منافع حاصل کرلیں بلکہ ہم میں بہت سے ایسے افراد

ہیں کہ اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہو دوسرے کو تو چاہے ہمیں وہ نہ ملتا ہو مگر ہم دراندازی کریں گے کہ اس کو یہ فائدہ نہ پہنچنے پائے اگر ہمارے اسلام کی یہ حالت ہے تو ہم جس حد تک تنزل نہ کریں تھوڑا ہے ہمارے درمیان میں وہ اخوت باقی نہ رہی جس کو اسلام نے روح حیات قرار دیا تھا' اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' جس پر اپنا احسان جتایا تھا'' كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا'' تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اوس خزرج کے خون کے پیاسے تھے، خزرج اوس کے گلے پر تلوار چلانے پر تیار تھے، اسلام نے ان اختلافات کو مٹا کر ایک نقطہ اخوت پر مجتمع کیا، لیکن ہم؟ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور ایک دوسرے کو پامال کرنے کے لئے تیار ہے ہم زبان سے مسلمان ہیں مگر اسلام کے نقش کو محو کر رہے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہم ترقی نہیں کرتے آپ سب لوگوں کا خیال ہوگا کہ اسلام مانع ترقی ہے یہ ہمارے طرز عمل کا قصور ہے کہ اسلام کو مانع ترقی ثابت کریں اگر اسلام اپنی حالت پر قائم رہتا تو ترقی ہمارے دم قدم سے وابستہ رہتی ہمارے سامنے بہتر سے بہتر تعلیمات موجود ہیں ہمارے سامنے رسولؐ کے اسوہ حسنہ ہیں۔ اہل بیت طاہرینؑ کی سیرتیں ہیں، کربلا کا عظیم الشان تاریخی واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے جس نے ہر قسم کے تعلیمات ہمارے سامنے پیش کئے، مواخات کا سبق، ایثار کا سبق، سال گذشتہ کے دس دن کے بیانات پر مستقل طور سے موضوع'' اسوہ حسینؑ'' تھا اس کو تفصیل سے عرض کیا گیا تھا، آج ہم منافع میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، مجالس کے حصول میں آپ دیکھ لیجئے، ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا ہے چاہے دوسرے کو تکلیف ہی پہنچ جائے، لیکن ہم ہی پہلے نکل جائیں اور مجلس کا حصہ حاصل کرلیں لیکن اگر خطرہ کا وقت ہو تو ہر ایک پیچھے ہٹنا چاہے گا، دیکھ لیجئے، آج مجالس میں جو سب سے پہلے حصہ لینا چاہتے ہیں وہ مجلس کی نشست میں سب سے موخر ہوتے ہیں اس لئے کہ منبر کے قریب بیٹھنے میں گرمی معلوم ہوتی ہے اور مجمع کی کشمکش ہوتی ہے یہاں ایک دوسرے پر سبقت نہ کرے گا کہ ہم ہی ذاکر کے سب سے زیادہ قریب ہوں، اس میں ہر ایک قدم پیچھے ہٹائے گا لیکن حصہ میں سبقت ضرور ہوگی۔

یاد رکھئے کربلا کے واقعہ میں سلاح جنگ تھے موت تھی جس میں ہر ایک دوسرے سے

آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا، واقعات مجھے بیان کرنا نہیں ہیں، واقعات تو آپ کے سامنے ہی ہیں مجھے صرف یاد دلا کر اس نتیجہ کی طرف متوجہ کرنا ہے وہ ایثار کا سبق، وہ ہمدردی کا سبق، ان کے پیش نظر یہ تھا کہ کم از کم وقت کے لئے بھی ہم دوسرے کو محفوظ رکھ لیں اور اپنی جان دے دیں انجام سب ہی کے پیش نظر تھا کون سمجھتا تھا کہ ہم چلے گئے تو دوسرے محفوظ رہ جائیں گے لیکن یہ تھا کہ جب تک ہم ہیں دوسرا نہ تلف ہو جتنی دیر کے لئے بھی ہو ہم دوسرے کو محفوظ کرلیں خود اپنی جان دے دیں یہ صورت عمل ہمارے سامنے پیش کی گئی لیکن ہم آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے۔

مسئلہ غلامی

اس مساوات کے خلاف جو میں پیش کر رہا تھا سب سے بڑا الزام جو پیش کیا جاسکتا ہے اسلام پر وہ غلامی کا مسئلہ ہے لیکن درحقیقت بے خبر ہے وہ تاریخ کے حقائق سے لاعلم ہیں وہ جو اسلام کی غلامی کو اس کی مساوات کے خلاف قرار دیتے ہیں انہوں نے نہیں سمجھا غلامی کو اسلام کی، جنہوں نے غلامی کو اسلام کی مساوات کے خلاف قرار دیا ہم کو غلامی کا صحیح مفہوم جو اسلام نے پیش کیا جس کو اپنی تعلیم کی روشنی میں ہم کو دکھلایا اگر دیکھنا ہے تو سیدہؑ کے گھر پر جائیں اور فضہ سے دریافت کریں کہ تمہارے ساتھ تمہاری شہزادی کا کیا برتاؤ ہے؟ اس گھر کی کنیز یہ جواب دے گی کہ ایک دن گھر کا کام میں کرتی ہوں اور ایک دن ملکہ خانی کرتی ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ درحقیقت غلامی غلامی نہ تھی، وہ لوگ افراد خانہ میں داخل کر لئے جاتے تھے کون نہیں جانتا کہ سلمان غلام تھے وہ سلمان جن کے نام کی عظمت کے سامنے اس وقت ہمارے دل لرزتے ہیں جن کے متعلق یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ ایمان کے دس درجے ہیں نو درجوں پر سلمان فائز ہیں، علم اول کو بھی جانتے تھے علم آخر کو بھی حاصل کیا تھا جن کے متعلق ہر ایک معزز کو یہ شکایت تھی کہ رسولؐ کی بارگاہ میں ان کی منزل ہم سے آگے ہے جن کے متعلق واقعات ہمارے سامنے تاریخوں میں پیش نظر ہیں کہ سلمانؓ ایسے ایسے وقت میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں پہنچتے تھے کہ دوسرا نہیں پہنچا وہ سلمانؓ درحقیقت خرید کردہ تھے رسولؐ اللہ نے ان کو خرید کیا تھا جو خرید کیا جائے وہ غلام نہ ہوا تو اور کیا ہوا۔ پھر آزاد کر دیا تھا ان کی منزل وہ تھی کہ اہل

بیت میں داخل کر لئے گئے"سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْت"۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے کسی نے سلمانؓ فارسی کہہ دیا، حضرت کا چہرہ متغیر ہو گیا کہا سلمانؓ فارسی نہ کہو سلمان محمدیؐ کہو، بلال غلام تھے اور حبشی غلام تھے میں نے عرض کیا کہ موذن کا عہدہ عطا کیا گیا تھا پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے، ہمارے پیش نظر یہ ہیں یہ روایات کہ بعد وفات رسولؐ انہوں نے مدینہ چھوڑ دیا تھا کہ میں اس شہر میں اب نہ رہوں گا جس میں رسولؐ نہ ہوں شام چلے گے تھے رسولؐ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ "اے بلال! تم اب ہماری قبر کی زیارت کو بھی نہیں آتے" بلال زیارت قبر رسولؐ کے لئے آئے ہیں اس موقعہ پر ہے کہ حسنینؑ نے چچا کہہ کر خطاب کیا۔ اور وہ خاص منظر تھا جب بلال نے اذان دی ہے تو مدینہ میں انقلاب عظیم برپا تھا۔

یہ ایک غلام کی شخصیت ہوتی ہے، آپ کے سامنے وہ واقعہ پیش ہوا کرتا ہے کہ جناب سید الشہداءؑ نے سلام کیا تھا فضہ پر بھی جس طرح سب پر سلام کیا تھا۔

جون غلام ابوذر غفاریؓ جب رخصت کے لئے آئے ہیں جس طرح عزیزوں کو روکا تھا ان کو بھی روکا گیا لیکن وہ حق شناس تھے عرض کیا کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا یہ کہا تھا کہ میرا رنگ سیاہ ہے، میرے خون میں بو آتی ہے، مطلب یہ تھا کہ میں آپ کے دامن سے تمسک چاہتا ہوں کہ صحیح آزادی کے حق کو حاصل کروں جس سے اسلام نے غلام کو بھی محروم نہیں رکھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب وہ گئے ہیں تو امام حسینؑ نے کیا برتاؤ کیا تھا، شاید تمام اصحاب کے بھی رخسارہ پر رخسارہ نہ رکھا ہو گا لیکن غلام کے رخسارہ پر رخسارہ رکھ دیا تھا۔

اسلام نے غلامی کو ایک نعمت قرار دیا، ان کے ساتھ ائمہ کرام کا طرز عمل، امام زین العابدینؑ کی کنیز کا واقعہ بھی آپ کے سامنے پیش ہوتا رہتا ہے۔

حضرت تشریف فرما تھے، کنیز گرم شوربہ لے کر آئی ہاتھ سے چھوٹ گیا اور حضرتؑ کے پاوں پر گرا، حضرتؑ نے بس ایک نگاہ ڈالی مگر جرم کے احساس سے دل اس کا لرز رہا تھا اس نے کہا (چونکہ افتاد طبع معصومینؑ معلوم تھی) "وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ" غصہ کے روکنے والے۔ آپؑ نے فرمایا "كَظَمْتُ غَيْظِي" اچھا میں نے روکا اپنے غصہ کو "وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ" اور عفو کرنے والے لوگوں کے، حضرتؑ نے فرمایا "میں نے تجھے معاف کیا"۔ اس نے کہا "وَاللّٰهُ

مُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" آپ نے فرمایا" میں نے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔

ایک شخص نے امامؑ سے عرض کیا کہ آپ کے غلام آپس میں تذکرہ کرتے ہیں کہ آپ کا کوئی رعب ان کے دلوں پر نہیں ہے، تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا اور فرمایا" میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کے بندے مجھ سے ڈرتے نہیں" یہ طرز عمل تھا، یہ طریقہ تھا تو کیا ایسی غلامی مساوات کے خلاف ہے؟

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غلام درحقیقت اپنے مالک کو بار خاطر نہ سمجھتے تھے، یہ غلام درحقیقت فرزندوں کی طرح رہتے تھے، غلام کا نام بدنام ہے مگر اچھائی اور برائی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے تو اسلام کی غلامی دوسرے اقوام کی آزادی سے بہتر ہے۔ اسی طرح ہر چیز میں مساوات امیرالمومنینؑ (قنبر آپ کے ساتھ تھے) تشریف لے گئے بازار میں، ایک کپڑا خرید کیا سات درہم کا اور ایک ۵ درہم کا، سات درہم والا کپڑا قنبر کو دیا گیا، پانچ درہم کا لباس خود زیب جسم کیا، قنبر نے عرض کیا کہ یہ لباس آپ زیب جسم فرمایئے، آپ نے جواب دیا (جیسے بچوں کو جواب دیا جائے) قنبر! تم نوعمر ہو، تمہارے لئے یہی لباس بہتر ہے میں یہ لباس پہن لوں گا۔

جو لوگ حلقہ معرفت الٰہی میں آجائیں اور اسلامی جامعہ میں مندرج ہو جائیں ان کے لئے غلامی کا سدباب ہو جاتا ہے، مسلمان کو غلام بنانے کا کسی کو حق نہیں، جو غلام ہوں ان کی آزادی پر بھی ایسے بیش قیمت ثواب کا اعلان کیا کہ اگر حقیقتاً کوئی پابند شریعت ہو تو اس اعلان پر یقیناً غلام کو آزاد کرنے پر متوجہ ہو جائے گا، جس نے ایک غلام کو آزاد کیا اس نے گویا ایک نفس کو زندہ کیا جس نے ایک غلام کو آزاد کیا اس نے گویا ستر برس خدا کی عبادت کی، خاص طریقوں سے غلاموں کی آزادی کا اعلان، درحقیقت اسلام اس غلامی کا جو مساوات کے لئے عار و ننگ ہو حامی ہو کر نہیں آیا۔ اسلام آزادی کا علم اٹھا کر آیا تھا اور خداوند عالم نے اسلامی قانون کے ذریعہ سے دنیا میں مساوات کی عمارت قائم کی کہ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ دوسرے کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔

مسلمانوں کی زندگی غیر اقوام کے ساتھ

وہ لائحہ عمل جو مسلمانوں کے لئے غیر اقوام کے ساتھ اختیار کرنے کے متعلق اسلام نے مقرر کیا ہے اور جس طرح رواداری کا ثبوت دیا ہے اس کا تذکرہ خود ایک طویل الذیل موضوع ہے جسے

اس مختصر وقت میں بیان نہیں کیا جاسکتا، دنیا ہمیشہ کسی بات کے سمجھنے میں نقطہ حقیقت تک نہیں پہنچا کرتی اس لئے اکثر لوگوں نے یہ غلط خیال قائم کرلیا کہ اسلام دوسروں کے ساتھ دوستی کا حامی نہیں ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف غیر مسلم اسلام پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اسلام امن وامان کا دشمن ہے اور دنیا میں فتنہ وفساد برپا کرنا اسلام کا کام ہے، دنیا کی خاموش فضا کو انقلاب سے تبدیل کرنا یہ اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔دوسری طرف خود مسلمان اسلامی تعلیم سے بے خبر ہونے کی وجہ سے سخت سے سخت طرز عمل کو جو مذہب کے نام سے دوسروں کے مقابلہ میں اختیار کیا جائے، اسلامی خدمت سمجھ کر کرنے لگے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے امن وامان کو حقیقتاً ٹھیس لگتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم واقعی اسلام کے تعلیمات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ درحقیقت اسلام نے غیر مسلمین کے ساتھ کیسے طرز عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس نے خود کس حد تک رواداری سے کام لیا ہے۔

میں مستقل طور سے گذشتہ دس مجالس میں جو منعقد ہوئی تھیں چار روز تک اسلام اور رواداری کے موضوع پر عرض کرچکا ہوں، میں نے جناب رسالت مآبؐ اور اہل بیتؑ کے اسوہ حسنہ اور طرز عمل سے یہ دکھلا دیا کہ اسلام کس طرح سے امن وامان کا حامی ہے۔میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اسلام شروع سے آخر تک ابتدا سے انتہا تک صلح وآشتی کا پیغام ہے امن وامان کا علمبردار ہے اس نے خود اپنے لئے نام "اسلام" کا اختیار کیا ہے جو "سلم" سے مشتق ہے اور "سلم" کے معنی صلح کے ہیں۔دوسری چیز جو اسلام کے ساتھ ساتھ طرہ امتیاز قرار دی گئی وہ "ایمان" ہے اور ایمان "امن" سے قرار دیا گیا جس کے معنی ہیں "امن وامان" یعنی مسلمان وہ ہے جو صلح پسند ہو، اور مومن وہ ہے جو امن پسند ہو۔صلح وآشتی اس کے نام کا جزو قرار دیا گیا، اس نے آپس کے برتاو میں آداب وقواعد قرار دیئے جن سے حقیقت کا پتہ چلتا ہے، حکم ہے کہ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے جب ملاقات ہوتو کہے "سَلَامٌ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَةُ اللهِ" اس طرح اپنی صلح پسندی کے جذبہ کا اظہار کرے۔یہ اور بات ہے کہ ہم تعلیمات اسلام سے بے خبر ہو گئے اس رسم کو بھی ترک کردیا ہم میں وہ ظاہری رسم بھی باقی نہیں رہی، لیکن اسلام کے تعلیمات برابر ان خاص خزانوں میں جو ان کے امانتدار ہیں محفوظ ہیں اور وہ ہمارے سامنے پیش نظر ہیں، اس شعبہ میں کہ اسلام نے ایک دوسرے مذہب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا ہے میری نظر سب سے پہلے اسلام کے ان تعلیمات پر پڑتی ہے

جو دوسرے مذاہب کے بنیادی عقائد کے ساتھ اسلام نے ظاہر کئے ہیں۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے دنیا کے کسی مذہب کو جو درحقیقت مذہب کی حیثیت رکھتا ہو، اصولی طور سے، بنیاد کے اعتبار سے باطل نہیں کہا یہ پہلی رواداری ہے اسلام کی غیر مسلموں کے ساتھ، یعنی ایک صورت یہ تھی کہ اسلام دنیا میں آ کر یہ اعلان کرتا کہ یہودیت بے حقیقت چیز ہے نصرانیت باطل ہے۔ دوسرے مذاہب جو ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو یہیں سے بنائے مخاصمت قائم ہو جاتی، یہیں سے اسلام کے خلاف دوسرے لوگوں کے دلوں میں جذبات عناد پیدا ہونے کا حق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے کسی مذہب کو اس کے اصل واصول اور بنیاد کے اعتبار سے باطل قرار نہیں دیا۔

آپ قرآن مجید کا مطالعہ کر ڈالئے شروع سے آخر تک اور دیکھ ڈالئے کہ اسلام نے کسی مذہب کو باطل کہا ہو یہاں ذرا میں مذہب کی اصطلاح کو بتاتا چلوں، تاکہ میرے بیان میں جو اصل میرا مقصد ہے واضح ہو جائے درحقیقت کچھ چیزیں تو وہ ہیں جو بطور طرز عمل کے مختلف اشخاص نے اختیار کر لی ہیں، کچھ چیزیں ہیں جو بطور مسلک اور بطور سیرت کے کچھ اشخاص نے اپنے لئے پسند کر لی ہیں، ان تمام چیزوں کو لغوی حیثیت سے آپ مذہب کہہ سکتے ہیں یعنی جانے کا راستہ وہ راستہ جس پر کوئی سالک ہو وہی اس کا مذہب ہے، اس اعتبار سے تو بے شک بت پرستی بھی ایک مذہب ہے، دہریت، الحاد، مادیت سب مذہب ہیں، راستہ کے معنی میں، مسلک کے معنی میں، رائے کے معنی میں، اس اعتبار سے تو کوئی بھی انفرادی واجتماعی راستہ جو کسی قوم یا شخص نے اختیار کیا ہو وہ مذہب سے باہر نہیں ہے لیکن جس اعتبار سے دنیا میں مذہب کی اصطلاح قائم ہوئی ہے جس لحاظ سے آپ مذہب ولا مذہبیت کا مقابلہ کرتے ہیں جس اعتبار سے مادیت، دہریت اور الحاد کو مذہب کا حریف مقابل قرار دیتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کسی خاص شریعت کا پابند ہو اور اس شریعت کو کسی سفیر الٰہی کے واسطہ سے خدا کی طرف منسوب کرتا ہو یہ معنی ہیں مذہب کے، یہودیت ایک مذہب ہے، نصرانیت ایک مذہب ہے، بدھ ایک مذہب ہے، دوسرے ہندوؤں کے جو دھرم ہیں وہ بجائے خود مذہب ہیں، زردشت کا مذہب ایک مذہب ہے، اس اعتبار سے آپ مذاہب عالم کا شمار کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنے تئیں کسی رہنمائے روحانی کی طرف منسوب

کرتے ہیں جب اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو بت پرستی بحیثیت بتوں کے سامنے سر جھکانے کے کوئی مذہب نہیں ہے مشرکین قریش جو بتوں کے سامنے اپنا سر نیاز جھکاتے تھے، انہیں اپنا خدا سمجھتے تھے، اس کو انہوں نے کوئی شریعت وقانون نہیں قرار دیا تھا، بلکہ یہ ان کا ایک ذاتی خیال تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی اس لحاظ سے پرستش کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا تک پہنچائیں ان کے ذریعہ سے ہم اس کی بارگاہ میں قریب ہوں گے یہ ایک طریق عمل ضرور تھا جو معین کر لیا تھا لیکن اس کو اس معنی سے مذہب کہنا صحیح نہیں ہے جس معنی سے عیسائیت کو یہودیت کو مذہب کہتے ہیں۔

درحقیقت جتنے مذاہب عالم ہیں اسلام نے کسی کو اصول اور بنیاد کے اعتبار سے باطل نہیں کہا، کہ یہ مذہب غلط ہے یہ مذہب باطل ہے اس لئے کہ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے ایک سفیر الہی کی وساطت سے، عیسائی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں عیسیٰ کی وساطت سے۔ یہودی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں موسیٰ کے واسطہ سے۔ ایران کے پارسی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں زردشت کی وساطت سے۔ اسی طرح ہندوستان کے مختلف مذاہب ان رہنماوں کی طرف سے جن کو وہ خدا کا فرستادہ بیان کرتے ہیں۔

ان مذاہب کو اصول واساس کی حیثیت سے بے بنیاد کہہ دینے کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اس شخص کی نبوت سے انکار کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ خدا سے رشتہ جوڑتے ہیں اگر کوئی موسیٰ کو بے اصل شخص کہہ دے تو یہودیت کی بنیاد منہدم ہو جائے گی۔

اسی طرح عیسائیت کا قلعہ بیخ دین سے گر جاتا، اگر اسلام عیسیٰ کے متعلق یہ کہتا کہ وہ خدا کے سفیر نہ تھے بلکہ ہمارے ایسے معمولی انسان تھے مگر جب ہم قرآن مجید کا جائزہ لیتے ہیں، شروع سے آخر تک آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلا استثنا اسلام نے کسی مذہب کے متعلق یہ آواز نہیں بلند کی کہ وہ اصل اور بنیاد کے اعتبار سے باطل ہے، بلکہ اس نے آواز بلند کی اور مجمل الفاظ میں کہا کہ تصدیق کرتا ہوں اپنے تمام پیش رووں کی، اس طرح سے اس نے رواداری کا سبق دیا، اپنے دائرہ عمل کو اس قابل قرار دیا کہ ہر مذہب والا اپنے اصل اصول مذہب پر قائم رہنے کے ساتھ مذہب اسلام کو تسلیم کرے (دوسرے لفظوں میں یہ عرض کروں) اسلام اگر یہ کہتا کہ حضرت موسیٰ خدا کے پیغمبر نہ تھے تو یہودی اپنے مذہب کی عظمت کو

اپنے دل میں جگہ دیتے ہوئے اسلام کو قبول نہیں کر سکتے تھے، اگر اسلام یہ کہتا کہ عیسیٰ دروغ گو تھے (نعوذ باللہ) تو عیسائی اپنے دل میں عیسائیت کو جگہ دیتے ہوئے اسلام کو قبول نہیں کر سکتے تھے، مگر اسلام نے یہ اعلان کیا کہ میں کسی پیش رو کو کسی کے مقتدا کی ہستی کو اس کی عظمت اور کمالات کو نبوت کے درجہ سے گرانے نہیں آیا اس نے کسی کے لئے یہ نہیں کہا کہ یہ غلط ہے اور باطل ہے یا اس کی سچائی کسی طرح سے معرض انکار میں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید میں شروع سے آخر تک جس وقت ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ جز ایسا ہے جس کو بار بار پیش کیا گیا ہے یہ آخر ہے کیا کہ اس جز کو بار بار پیش کیا جاتا ہے؟

اگر ان تمام آیات کو پیش کیا جائے جس میں قرآن مجید نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت پیش کی کہ میں اپنے پیش رووں کی تصدیق کرتا ہوں تو کلام بہت طویل ہو جائے گا، مگر جتنی وقت میں گنجائش ہے "كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا" بلا استثناء دنیا کے ہر مذہب کو دعوت دی جارہی ہے واقعہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے آیات میں غور نہیں کرتے اگر غور کریں تو جس حقیقت کو ہم واقعی سمجھیں وہ قرآن مجید میں مضمر آئے گی۔

میں نے ابھی یہ عرض کیا کہ اسلام نے ایک دائرہ اجتماعی ایسا قرار دیا جس میں ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ماننے والا اپنے تمام جذبات کے ساتھ، اپنے ان تمام اعتقادوں کے ساتھ جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہیں اسلام میں داخل ہو سکتا ہے ایک عیسائی ان تمام اعتقادوں کے ساتھ جو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ بحیثیت نبوت و رسالت کے اس کو حاصل ہیں اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔

اسلام یہ کہتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک باقی رہے ان تمام عقیدوں پر جو تم کو اپنے رہنماؤں کے ساتھ حاصل ہیں لیکن میں تمہارے سامنے ایک قانون اصلاح پیش کرتا ہوں، آؤ اس کو بھی قبول کرلو، پہلے کی نفی نہ کرو، لیکن اس جزو کو تسلیم کرلو، اگر کہیں پر سے انکار کا محل ہوتا تو (چونکہ نفی و اثبات جمع نہیں ہو سکتے) تصادم کی گنجائش تھی جیسے مشرکین کے مقابلہ میں مسئلہ توحید میں "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پہلے ہی جس چیز کو نمایاں کیا گیا وہ نفی ہے۔ وہ ٹکراتی ہے اس بات سے جو اس کے ذہن میں تھی لیکن مسئلہ نبوت میں اسلام نہیں کہتا "لا نبی الا محمد" رسول کی زبان سے یہ نہیں نکلتا کہ "لَا رَسُوْلَ اِلَّا اَنَا" کوئی رسول نہیں ہے سوائے میرے۔ بے شک اگر ایسا ہوتا تو تمام

مذاہب عالم کے ساتھ بنائے مخاصمت پیدا ہو جاتی بلکہ اس کے خلاف قرآن مجید کہہ رہا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔

نہیں ہے میرا بندہ خاص محمد مگر ایک رسول جس کے قبل بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔

جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے معیار کو تمام پیشروں کے ساتھ مساوی قرار دے رہے ہیں جو پہلے گذر چکے ہیں اس طرح ہر ایک انسان ان تمام جذبات عقیدت کے ساتھ جو اپنے رہنماوں کے ساتھ ہیں اسلام کے جامعہ میں داخل ہو سکتا ہے اس کو دو لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔

سب اس میں داخل ہیں، ایمان لاؤ اس شئے پر جو ہم نے اب نازل کی ہے، تسلیم کرتے ہوئے ان تمام چیزوں کو جو تمہارے پاس موجود ہیں تم کو کسی نقطہ پر خط نفی کھینچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تم مانے جاو زروشت کو عیسیٰ کو مگر رسول کو بھی تسلیم کرلو۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ۔ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ۔

جب ان کے پاس آئی وہ کتاب جو تسلیم کرتی ہے تمام ان کتب کو جو ان کے پاس ہیں اور اس سے قبل وہ خود امیدیں ظاہر کرتے تھے اس کتاب کے متعلق، لیکن وہ اب انکار کرتے ہیں۔

دیکھئے ایک چیز یہ تھی کہ وہ کسی چیز کا اثبات کرنے والے ہوں، اور مذہب اسلام نفی کرتا ہو، تو یہاں مذہب اسلام کے جانب سے بنائے مخاصمت قائم ہوتی ہے اور ایک یہ بات ہے کہ مذہب اسلام کسی کی بھی نفی نہیں کرتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے۔ یہاں جو کچھ بنائے مخاصمت پیدا ہوتی ہے وہ ادھر سے، اسلام پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا بلکہ اسلام کو یہ شکوہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ہم پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں مانتے:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ۔ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ۔

وہی بنائے مخاصمت پیش کی جارہی ہے یہ نہیں کہ وہ کوئی چیز پیش کرتے ہیں اور ہم نہیں مانتے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ، اس پر جو خدا نے نازل کیا ہے وہ کہتے ہیں بس! جو ہمارے اوپر نازل ہو چکا ہے ہم اسی پر ایمان لاتے ہیں اس کے علاوہ انکار کرتے ہیں حالانکہ یہ حق ہے اور تصدیق کرنے والا ہے ان چیزوں کی جو ان کے پاس ہیں۔

یہاں دونوں پہلو پیش کر دیئے، قرآن کا اقرار ان ہستیوں اور شخصیتوں کے ساتھ جن کو وہ مانتے ہیں اور ان کا انکار اس اصول سے جس کو اسلام پیش کر رہا ہے، اس کے بعد یہ کہا گیا کہ ان کے سامنے اعلان کر دو کہ ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے کہ ہم انبیاء میں سے کسی کو تسلیم کریں اور کسی کو نہ کریں ہم تو سب کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم تم سے بھی یہی چاہتے ہیں تم بھی سب کو تسلیم کرلو۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔

یہ آیت بنیاد ہے اس تمام میرے بیان کی جس کو میں آپ کے سامنے اسلامی رواداری کے شعبہ میں عرض کر رہا ہوں۔

ارشاد ہوتا ہے مسلمانوں سے خطاب کر کے'' یہ کہو تم مذاہب عالم سے کہ ہم تو ایمان لائے ہیں خدا پر اور اس پر جو ہماری جانب نازل ہوا اور جو نازل ہوا تھا ابراہیمؑ پر اسماعیلؑ پر اور جو تعلیمات بھی تھے اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اسباط بنی اسرائیل اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو، اور جو دوسرے نبیوں کو ملے تھے ان کے رب کی طرف سے سب کا ہم اقرار رکھتے ہیں۔

ہم ان میں تفریق نہیں ڈالتے کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں اور ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (تو اب تم بھی سب چیزوں پر ایمان لے آؤ جس کے ہم مومن ہیں)۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

اگر یہ بھی ایمان لے آئیں انہی چیزوں پر جن پر تم ایمان لائے ہوئے ہو تو یہ ہدایت پاگئے اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو یاد رکھو کہ پھوٹ ڈالنے والے یہی ہیں (شقاق کے معنی ہیں شق ہوجانے کے لفظی معنی ہوئے پھوٹ ڈالنا) تو تمہیں کوئی پروا نہیں خدا تمہارا مددگار ہے اور وہ تمہاری آواز کا سننے والا ہے تمہارے حالات سے باخبر ہے۔ یہ جزو "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" مسلمانوں کے قوت انتقام کو روکنا ہے یعنی اگر انہوں نے روگردانی کی تو یہی پھوٹ ڈالنے والے ہیں مگر اب تم تلواریں لے کر ان پر جا پڑو؟ نہیں بلکہ خدا کے حوالہ کرو ذمہ داری تو ان پر عائد ہے لیکن تم ؟ خبردار! تم حد سے نہ بڑھنا خدا تمہارا والی ہے اس طرح یہ بتایا کہ افتراق ادھر سے ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔

ہمارا رسول خود اقرار کرتا ہے ایمان لایا ہے ان چیزوں پر جو اس پر نازل ہوئیں، خدا کی طرف سے اور وہ جو ایمان لائے ہوئے ہیں اس کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتا۔ ہم کسی کا انکار نہیں کرتے "نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ" اس نے نازل کیا تمہارے اوپر کتاب کو حق کے ساتھ جو تسلیم کرنے والی ہے اس کو جو اس کے پہلے تھا۔ کوئی تعین نہیں کی توریت کی، انجیل کی تاکہ دوسری کتابیں جو تھیں وہ خارج نہ ہوجائیں کسی کو وہ جھٹلانے پر تیار نہیں:۔

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ۔

اس نے نازل کیا توریت کو انجیل کو، ان کے نام خصوصیت سے اس لئے لئے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا ہے جو لوگ براہ راست مخاطب تھے وہ یہودی اور نصاریٰ ہی تھے۔ اس لئے عمومی دائرہ میں تو سب کو لے لیا اور خصوصیت سے انجیل اور توریت کا نام لے لیا اگر اس زمانہ کے عربوں کے سامنے مثلاً نام لیا جاتا ہندوستان کی کتابوں کا جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے تو کون سمجھتا، اس کو عموم میں رکھا، نام لینے کی ضرورت نہیں ہے امکان ہے اس میں ہر ایک کے

آ جانے کا، آگے چل کر ارشاد ہوا کہ وہ بھی لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھیں اسی خدا نے قرآن مجید بھی نازل کیا ہے:۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ.

شبہ ہوگا کہ یہ آیت وہی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی نہیں یہ دوسری آیت ہے اس میں "قولوا" تھا اس میں "قل" ہے وہاں تمام مسلمانوں سے کہلوایا گیا، یہاں صرف رسولؐ سے کہلوایا جا رہا ہے۔ مگر بحیثیت نمائندہ تمام عالم اسلام تم کہو اے رسول! کہ ہم سب ایمان لائے ہیں اس پر جو ہمارے اوپر نازل ہوا اور اس پر جو نازل ہوا ابراہیمؑ اسماعیلؑ وغیرہ وغیرہ پر۔

اس طرح سب کے لئے جگہ رکھی آیت نے عموم پیدا کر کے، اور کچھ نام لے دیا جگہ دی ہر مذہب والے کو یہ کہہ کر کہ "وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ" تمام وہ نبی جو رب کی طرف سے تھے، ان سب پر ہم ایمان لائے۔ کسی میں تفریق نہیں قرار دی:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ.

یہاں اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے جن کو خداوند عالم سے کتاب عطا ہوئی، براہ راست یہود و نصاریٰ ہیں لیکن عموم میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کتاب خدا کا مدعی ہو، اس لئے کہ قرآن نے الفاظ عام کر دیئے ہیں۔

اے وہ کہ جو کتاب خدا کے ماننے والے ہو، اس کو بھی مان لو جس کو ہم نے اتارا ہے پھر جو اتارا ہے یہ خلاف نہیں ہے اس کے جو تمہارے پاس تھا یہ تو اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا . اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا.

وہ لوگ جو کفر اختیار کرتے ہیں، انکار کرتے ہیں، خدا کا اور اس کے رسول کا اور وہ یہ

چاہتے ہیں کہ تفریق ڈالیں خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان میں اور یہ کہتے ہیں کہ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں (یہودی کہتے ہیں ہم موسیٰؑ پر ایمان لئے ہیں مگر عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لائے، نصاریٰ کہتے ہیں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مگر محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے) یہ چاہتے ہیں کہ ایک درمیانی راستہ اختیار کریں، یہ لوگ بیشک کافروں میں داخل ہونے کے لائق ہیں اور کافروں کے لئے عذاب دردناک ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

جو ایمان لائے ہیں خدا اور اس کے تمام رسولوں پر اور ان میں تفریق نہیں کرتے ہیں وہ بے شک مغفرت کے مستحق ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محاورہ اور اصطلاح کو جو اس نے قرار دی ہے واضح کردوں۔

میں نے عرض کیا کہ بنائے مخاصمت جو پیدا ہوئی تھی اسلام اور دوسرے مذاہب میں وہ اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کی طرف سے تھی، اسلام تو ان سب کا اقرار کرتا ہے جس کو دوسرے منوانا چاہتے ہیں مگر وہ انکار کرتے ہیں تو اب دیکھئے قرآن مجید نے اصطلاح کیا قرار دی اپنے حلقہ بگوشوں کے لئے یہ کہا کہ تم ''مسلم'' ہو کیا معنی یعنی سر تسلیم خم کرنے والے۔ یہ مسلمان ہوئے، جو اس کے خلاف ہے اس کے لئے ''کافر'' کا لفظ قرار دیا گیا ہے۔ کافر کے معنی؟ انکار کرنے والا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بس افتراق یہاں سے پیدا ہوا اسلام اور اقرار کرتا ہے کسی کا انکار نہیں کرتا اور دوسرے انکار کرتے ہیں یہاں حد فاصل کھینچی ہے کفر کے معنی چھپانے کے بھی ہیں اس لفظ کو قرآن مجید نے یوں صرف کیا ہے کہ یہ لوگ جو تفریق کرتے ہیں یہ حقدار ہیں اس کے کہ ان کو کافر کہا جائے، اس لئے کہ انہوں نے انکار اس بات کا کیا جو ماننے کے قابل تھی جو اسلام کے ماننے والے ہوئے وہ مسلم ہوئے جو یقین کرنے والے تھے وہ مومن ہوئے یعنی یقین کرنے والے ایمان لانے والے ہیں، اسلام کا کام ہے ''ماننا'' کفر کا کام ہے ''نہ ماننا'' یہی تفریق دنیا میں قائم کی گئی ہے۔

اب اگر اسلام نے بھی کسی چیز سے انکار کیا ہوتا تو بے شک دوسرے لوگوں کو بھی یہ کہنے کا اختیار ہوتا کہ جس طرح ہم اقرار کرتے ہیں کسی چیز کا اور انکار کرتے ہیں اسی طرح تو تم بھی کسی کا اقرار کرتے ہو اور کسی کا انکار کرتے ہو، لہٰذا تم بھی کافر ضرور ہوئے مگر اسلام نے تو کسی کا انکار کیا ہی نہیں تو پھر وہ الفاظ اب نہ رہے کیونکہ اسلام نے تو ایک معیار پیش کر دیا، لغوی معنی کے تحت میں نے ایک لقب دے دیا ہم اس لقب کی زد میں نہیں آتے اور یہ جب ہوگا کہ جب اسلام انکار نہ کرے کسی ایسی فرد کا جو اس کے پہلے سے مانا جا رہا ہو اسلام کی تعلیم صرف ماننا ہے اس کے مقابلہ میں اغیار جو ہیں وہ نہ ماننے کے جرم کے مرتکب ہیں یہ لوگ کافر ہیں۔ قرآن کوئی خاص محاورہ اور اصطلاح نہیں قرار دے رہا ہے بلکہ لفظ کو معنی پر منطبق کرنا چاہتا ہے لہذا یہ مستحق ہیں کہ ان کو کافر کہا جائے یہ استدلال ٹوٹ جاتا اگر اسلام بھی کسی کا انکار کرتا۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا.

یہاں ایک حقیقت کا انکشاف کیا ہے جسے میں چاہتا تھا کہ آئندہ بیان کروں لیکن چونکہ وہ آیت آگئی اس لئے کہہ دینا ضروری ہے "انبیاء" اور "مرسلین" وہ ہیں جنہیں صریحی طور سے تسلیم کیا گیا ہو جیسے عیسیٰ، موسیٰ، ابراہیمؑ، ان کی نبوت کی قرآن مجید میں صریحی طور سے تفصیل موجود ہے اور بہت سے وہ اشخاص ہیں جن کو بہت سے لوگ اپنا پیشوا مانتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کی نبوت کے مدعی ہیں لیکن قرآن مجید میں ان کی صریحی طور سے تفصیل نہیں ہے جیسے، زردشت ان کے متعلق کتاب سماوی بھی کہا جاتا ہے کہ موجود ہے ایرانیوں کے پاس جو خدا کی طرف سے ایک کتاب مانی جاتی ہے "ژند" اصل کتاب "پاژند" اس کی شرح ہے جو ان کے نزدیک الہامی حیثیت رکھتی ہے اس پر شروح وحواشی تحریر کئے گئے ہیں یا جیسے ہندوستان کے مختلف افراد کے مذاہب جو اپنے اپنے پیشواؤں کو مانتے ہیں اور ان کے لئے ایک شریعت کے قائل ہیں ظاہری نظر میں مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب سچے تھے مگر ایسا بھی نہیں کہ زردشت کو غلط سمجھیں اور نہ ان کو جو دوسرے مذاہب

کے پیشوا ہیں ان کو کاذب سمجھیں، محض اس لئے کہ اسلام نے ان کی تفصیل نہیں کی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب ان کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں ہے تو ایسے الفاظ بھی استعمال کر دیئے جاتے ہیں جو ایک رہنمائے مذہب کی حیثیت کے خلاف ہے ایسے الفاظ استعمال کر دئے جاتے ہیں جو ایک جھوٹے شخص کے لئے استعمال ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف جذبہ عناد پیدا ہوتا ہے لیکن اگر آیت پر غور کیجئے تو یہ اندازہ ہوگا کہ اسلام نے کچھ لوگوں کے نام لے کر تفصیل کی ہے اور کچھ لوگوں کے ناموں کی تفصیل نہیں کی۔

ہمارا یہ خیال ہے خیال ہی نہیں بلکہ دلیل کے ذریعہ سے مضبوط حیثیت رکھتا ہے کہ جناب رسالت مآب کے قبل جتنے انبیا و مرسلین تھے ان کے دلائل نبوت ختم ہو چکے موجودہ دور زمانہ میں کسی مذہب کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مذہب کی حقانیت کو منوا سکے۔ عیسائیوں کے پاس دلیل نہیں ہے زردشتیوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے کہ ان کی نبوت و رسالت کی بنیاد تھی جن دلائل پر وہ دلائل وقتی حیثیت رکھتے تھے ہمارے لئے وہ سمعی روایت سے بڑھ کر نہیں ہیں وہ بھی صرف ایک مذہب کے حلقہ بگوشوں ہی میں جاری ہیں وہ ان لوگوں کے تسلیم کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں جو اس مذہب کے نہ ہوں ہر مذہب کا پیشوا جو بھی ہو اس مذہب کے افراد میں اس پیشوا کے متعلق بہت سی غیر معمولی باتیں ضرور مشہور ہوا کرتی ہیں اس قسم کے دلائل درحقیقت بروقت وقوع دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور بے شک جس وقت ان دلائل سے کام لیا گیا تھا اس وقت وہ کامیاب بھی تھے ایک دلیل کی کامیابی کا معیار اتنا ہے کہ اس کو دیکھ کر تسلیم نہ کرنے والا، بس ہٹ دھرم سمجھا جائے، اور ایک منصف مزاج اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہو تو یقیناً وہ دلیل عقلی حیثیت سے کامیاب ہے لیکن اب وہ دلائل بالکل موجود نہیں ہیں۔

اس لئے میں سچ کہتا ہوں کہ موسوی قاصر ہیں موسیٰ کی نبوت ثابت کرنے سے، عیسائی قاصر ہیں عیسیٰؑ کی نبوت ثابت کرنے سے، مسیح حقیقتاً خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے مگر دنیائے عیسائیت اس کے اثبات میں عاجز ہی ہے ہمارے مقابلہ میں نہیں، یہودیوں کے مقابلہ میں دلائل نہ ملیں گے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ثابت کر سکیں۔ اب وہ نشانیاں بھی رخصت ہو چکی ہیں جو اس وقت موجود تھی، اب اگر یہودی انکار کریں حضرت عیسیٰؑ سے تو عیسائیوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے

لیکن مسلمانوں کے لئے اسلام زندہ مذہب ہے اس لئے کہ اس کے دلائل زندہ ہیں اس کے حجج وبراہین زندہ ہیں موسائی خاموش ہوجائیں موسیٰ کی نبوت ثابت کرنے کے مطالبہ پر، مسیحی خاموش ہوجائیں لیکن ایک مسلمان نہیں خاموش ہوگا، اس لئے کہ اسلام کی حقانیت صرف معجزہ شق القمر پر نہیں تھی، جو ایک وقت میں ہوگیا معجزہ ردالشمس پر نہیں تھی، کنکریوں کے تسبیح پڑھنے پر نہیں ،وہ درخت کے کلام کرنے پر مبنی نہیں، اس لئے جس شخص نے نہیں دیکھا وہ کہے کہ معلوم نہیں ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا۔ اسلام کی حقانیت تو مذہبی تعلیم پر مبنی ہے جس کا نام ہے "قرآن" اسلام اپنی حقانیت کے ثبوت میں معجزہ ردالشمس کو نہیں پیش کرتا تاکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کو لے کر اعتراض کیا جائے نہ شق القمر کو پیش کرتا ہے۔

میں لکھ چکا ہوں تفسیر کے سلسلہ میں کہ درحقیقت معجزہ ردالشمس یا شق القمر تمام ایسی چیزیں تھیں جو اسلامی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ہماری نظر میں اس مرتبہ کی بلندی کو دیکھتے ہوئے جو رسول اور اہل بیت رسول کو حاصل تھی وہ روزمرہ کی باتیں تھیں جو ہوا کرتی تھیں وہ ایک کرامت تھی جو خدا کی طرف سے حاصل تھی لیکن اسلام نے کبھی اس کو حقانیت کے ثبوت میں پیش نہیں کیا ۔آپ تاریخ کے اوراق دیکھ ڈالئے، کبھی رسولؐ نے کسی منکر اسلام کے سامنے یہ کہا ہو کہ میں سچا نبی ہوں اس لئے کہ ایک دن میرے لئے قمر شق ہوا ہے، کبھی امیرالمومنین نے یہ کہا ہو کہ میں سچا امام ہوں اس لئے کہ ایک مرتبہ آفتاب میرے لئے پلٹا تھا، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے ہم کبھی اسلام کے ثبوت میں ایسی چیزوں کو پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ معجزہ ایک ویسا ہی معجزہ ہے جیسے موسیٰ کے لئے عصا کا اژدھا بن جانا، جیسے درخت کا موسیٰ سے کلام کرنا، یا جیسے ان کے ہاتھ کا روشن ہونا، ہم اسلام کے لئے یہ دلائل پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ہمارے سامنے وہ معجزات ہزار حقیقتوں سے بڑھ کر حقیقتیں رکھتے ہیں لیکن ہم ان کو کوئی اسلام اور کفر کی بحث نہیں بنائیں گے۔

ہم اگر آج ردشمس پر بحث کریں گے تو تاریخی واقعہ کی حیثیت سے کہ کہاں تک روایات سے ثابت ہوتا ہے، شق القمر پر بحث کریں گے تو تاریخی حیثیت سے بحث کریں گے۔ اسلام اور کفر کی دلیل بنا کر نہیں پیش کریں گے۔ اسلام کی دلیل ہے "قرآن" اس نے جس جس کو تسلیم کیا وہ بجائے خود مردہ تھا زندہ ہوگیا موسائیوں کے پاس دلیل نہیں موسیٰ کی حقانیت کی مگر ہمارے پاس ہے عیسائیوں

کے پاس عیسیٰؑ کے سچے ہونے کی دلیل نہیں مگر ہمارے پاس ہے، کسی پیغمبر کے پاس کوئی دلیل نہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام دنیا کے مذاہب اگر اسلام اقرار نہ کرتا تو مشکوک ہی رہتے۔

اگر اسلام انکار کردیتا تو کون اس کی زبان پکڑتا، مگر اس نے موسیٰؑ کا اقرار کرکے موسویت کو زندہ کیا، عیسیٰؑ کا اقرار کرکے عیسویت کو زندہ کردیا کسی مذہب کے پاس دلائل نہیں تھے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قطعی طور سے غلط کہہ دیں، ثابت نہ ہونا اور بات ہے اور جھوٹا ہونا اور بات ہے شب کو ہمارے یہاں چوری ہوگئی اور ہمارا دس روپیہ کا نوٹ کسی نے نکال لیا، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ سب کو جھوٹا کہہ سکیں اگر وہ شہادت پیش نہ کرسکے، ثبوت کا ہونا اور چیز ہے غلط ہونا ار چیز ہے اگر قرآن میں موسیٰؑ کو جھوٹا ماننے کا حق نہیں رکھتے زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ یقینی طور سے سچا سمجھنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی تمام انبیاء کے لئے یہ ہے کہ چاہے ثابت نہ ہوجائے ہم ایمان نہ لائیں لیکن انکار بھی نہ کریں زردشت اور دوسرے پیشوا جن کو مختلف مذاہب مانتے ہیں قرآن نے موقع ضرور دیا ہے ان کی سچائی کا، اگر قرآن یہ کہہ دیتا کہ جن کے نام میں نے بتادیے بس اتنے ہی ہیں اور کوئی نہیں ہے، تب تو ہم یقینی طور سے ان کو غلط گو کہنے کا حق رکھتے لیکن قرآن انہی پر حصر نہیں کرتا تو اب آپ کو کسی کے دعوے کو غلط کہنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن تو صراحتاً یہ ارشاد کرتا ہے کہ "وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ"۔

بہرحال ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ کچھ انبیا کا تذکرہ نہیں ہوا، ہم نے جو وحی کی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے وہ اسی طرح کی ہے جیسے نوحؑ پر ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ پر، اسحاقؑ پر یعقوبؑ پر اسباط بنی اسرائیل پر عیسیٰؑ پر ایوبؑ پر یونسؑ پر ہارونؑ پر سلیمانؑ پر اس کے پہلے ہوئی اور داودؑ کو ہم نے زبور عطا کیا اور بہت سے رسول ایسے تھے جن کا ہم نے اس سے پہلے تذکرہ کیا ہے اور بہت سے ایسے بھی تھے جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔

تو معلوم ہوا کہ جن کے نام لئے گئے ہیں قرآن مجید میں اور ان کے علاوہ بھی کچھ تھے ایسے افراد جن کے نام نہیں لئے گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے غلط گو دعویٰ کرنے والے بھی گذرے ہیں جن کی خبر برابر توریت میں دی گئی ہے، ہیں یا سے اور آئندہ بھی ہوں گے رسولؐ کے زمانہ میں بھی ہوئے ہیں مسلیمہ کذاب، ترقی کرنے لگا تھا زمانہ

رسولؐ میں، ایک عورت نے بھی دعویٰ کر دیا تھا ترقی کا یہی معیار ہے نہ؟ نبی ہے تو نبیہ بھی ہو، استدلال یہ بھی کیا گیا تھا کہ حدیث تو یہ ہے کہ "میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا" مگر یہ تو کہا نہیں تھا کہ نبیہ بھی نہیں ہوگی، ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوا کئے ہیں تو اسی وجہ سے آشیانہ نبوت دو عملہ میں پڑ گیا یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے کہ بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے نام نہیں ذکر کئے گئے، اس میں زردشت بھی آسکتے ہیں اس میں اور دوسرے پیشوایان مذہب بھی آسکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ نام نہیں لکھے ہوئے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ غلط گو بھی کچھ ہوئے ہیں دنیا میں تو ہر ایک آ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی آسکتا۔ اس لئے بحیثیت مسلمان ہونے کے ایمان لانے کی کوئی وجہ نہیں پاتے زردشت پر، کرشن جی پر۔ دوسرے اوتاروں پر لیکن یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم برا کہیں ہم کلمات ذلت آمیز استعمال کریں لیکن اگر کسی شخص کے لئے کسی وجہ سے تاریخی بنا پر درحقیقت ثبوت حاصل ہو جائے، زردشت کی نبوت یا کسی دوسرے پیشوائے مذہب کی رسالت کا تو اسلام منع بھی نہیں کرتا اس لئے کہ اسلام نے کہہ دیا کہ بہت سے ایسے رسول ہیں جن کا قصہ ہم نے تم سے نہیں بیان کیا۔ ہو سکتا ہے کہ زردشت بھی انہی میں سے ہوں لیکن ایک اختلافی چیز ہے اور ہماری نظر میں وہ قرائن تاریخی کمزور ہیں تو ہم تسلیم نہ کریں گے۔

مانتے ہو اگر زردشت کو، تسلیم کرلو، نبی جیسے حضرت موسیٰؑ کو مانتے ہو ویسے ہی مان لو، موسیٰؑ کی شریعت کو اسلام نے نسخ کر دیا، ویسی ہی زردشت کی شریعت بھی سہی۔

مگر وہ تعلیم وقانون اب واجب العمل ہو؟ ایسا نہیں ہے، وہ فسانہ ماضی ہو گیا، مان لیجے مگر وہ عملی چیز نہیں رہی فرض کیجئے کل آپ نے اپنے ملازم سے کسی کام کو کہا بہت بلند آواز سے کہا تھا وہ سو رہا تھا جب اس نے دوسرے دن آنکھ کھولی اسے معلوم ہوا جان تو لیا مگر اب جان کے کیا کرے؟ کچھ نہیں اس لئے کہ وقت اس عمل کا گذر گیا ویسا ہی یہ ہے زردشت نبی تھے یا نہیں؟ اچھا تھے نبی۔

قرآن مجید نے تمام انبیا کی حقانیت اور سچائی کے لئے حق رکھا ہے اس لئے ایک مسلمان زردشت کی نبوت کا قائل ہو اسی حد میں جتنا اسلام نے بیان کیا ہے تو زردشت کی کتاب بھی سہی یہ وید بھی سہی تو قابل اعتراض ہمارے لئے نہیں ہے مسلمانوں کو یہیں سے ایک سبق ملتا ہے کہ کسی

دوسرے مذہب کے پیشواوں کے خلاف تم بے ادبی سے اعتراض نہ کرو بلکہ خاموش رہو، یا ایسے الفاظ کہو کہ تعریف بھی کر دو مگر تعریف سچ ہو اگر تم اس کی کسی عظمت کے قائل ہو جاؤ تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اگر یہ دل نشیں ہو جائے تو بہت سے عناد و مخاصمت کے دروازے بند ہو جائیں جو کھلے ہوئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے، یہودیوں کے مقابلہ میں:۔

عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ۔

ان کے پاس توریت موجود ہے مگر عمل نہیں کرتے۔

اس کے علاوہ یہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔

جو لوگ خدا کی اتاری ہوئی بات کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتے یہ انکار کرنے والے کافر ہیں۔

یہاں سے بھی درحقیقت اسلام کی ایک اور رواداری کا پتہ چلتا ہے، آپ ذرا حقیقت امر پر غور کیجئے، واقعہ کی نوعیت پر ایک اقرار کرنے والا، ایک انکار کرنے والا، وہاں اسلام نے جو سخت سے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں وہ "انکار کرنے والا" یعنی "کافر"۔

درحقیقت اگر آپ ان سے پوچھتے تو وہ خود کہتے کہ ہم ضرور کافر ہیں ہم تسلیم نہیں کرتے۔

اسلام پر یہ اعتراض نہ کیجئے کہ "لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ" برے لقب سے نہ یاد کرو۔ وہ کافر تک کے مقابلہ میں اس پر عامل ہے کہ کوئی برا معلوم ہونے والا لفظ نہیں استعمال کیا بلکہ جو واقعہ تھا "انکار کرنے والا" وہ لفظ دے دیا، تو معلوم ہوا کہ اسلام نے درحقیقت دوسرے مذہب کے مقابلہ میں ایک حد فاصل قرار دی ہے کہ ہم کسی مذہب کا اس کے اصل اور بنیاد کے اعتبار سے انکار نہیں کرتے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہارا مذہب ایک صحیح اصول پر مبنی ہے، ایک صحیح بنیاد قائم ہے، یہ عام افراد کی کارستانی ہے کہ غلط فہمیاں شریک کر دی ہیں، ہر مذہب بحیثیت روح و جوہر کے حق ہے، روح تمام مذاہب کی ایک ہے، اس لئے یہ ارشاد ہوا کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہ سمجھو اصل دین تو کبھی بدلتا ہی نہیں اصل تو سب کی ایک ہے موسائیت درحقیقت اسلام ہے عیسائیت حقیقتاً اسلام

ہے زرشیت درحقیقت اسلام ہے فروع اور چیز ہیں ان کا نام ہوتا ہے شریعت لیکن دین نام ہوتا ہے اصول کا، دین ایک ہی ہوتا ہے دین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

"لَا تَبْدِيْلَ لِسُنَّةِ اللهِ" خدا کی مقرر کیے ہوئے راستے میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْاِسْلَامُ" "دین تو بس خدا کے یہاں ایک ہی ہے جس کا نام ہے اسلام۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے، آدمؑ آئے انہوں نے کیا کہا؟ مجھے تسلیم کرو جو مانے وہ "مسلم" جو نہ مانے وہ "کافر" نوحؑ آئے کہا مجھے تسلیم کرو جس نے مانا وہ مسلم جس نے نہ مانا وہ کافر، موسیٰؑ آئے کہا مجھ کو مانو جس نے مانا وہ مسلم جس نے نہ مانا وہ کافر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دین میں ہمیشہ بس مسلم اور کافر ہی کی تفریق رہتی ہے دین حق کے ماننے والے ہمیشہ مسلم رہے الگ جانے والے ہمیشہ کافر رہے۔

اس لئے یہ ارشاد ہوا کہ درحقیقت یہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں نام کی تبدیلیاں بعد کو پیدا ہوگئی ہیں مفہوم "مسلم" پہلے سے تھا، لقب ابراہیمؑ نے دیا "هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ" یہ نہیں کہا تمہیں مسلم بنایا انہوں نے مسلم ہمیشہ سے تھا بطور نام بحیثیت لقب کے ابراہیمؑ نے تمہارا نام مسلم قرار دیا وجہ تسمیہ پہلے سے موجود تھی۔

اس کے بعد یہ اعلان کیا کہ "وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ" دنیا میں کوئی ملک اور کوئی امت نہیں ایسی جس میں نے نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا ہے، ہر امت کے لئے ایک رسول ہے۔

میرا کلام ان افراد کے متعلق تھا ان پیشوایان مذہب سے متعلق تھا جن کی طرف مختلف مذہب نسبت رکھتے ہیں جیسے یہودیوں کو حضرت موسیٰؑ سے نسبت ہے یا عیسائیوں کو حضرت مسیحؑ سے یا پارسیوں کو زردشت سے اور ہندوں کے مختلف مذاہب کو اپنے اپنے پیشرووں کی طرف نسبت حاصل ہے اصل نقطہ بحث وہی تھا اس کے متعلق کلام کیا گیا اور میں نے یہ کہا کہ وہ افراد جو متحمل النبوۃ ہیں یعنی جن کی نبوت دائرہ ثبوت میں نہیں آئی ہے لیکن قطعی طور سے کوئی دلیل ان کے بطلان پر بھی قائم نہیں ہوئی ان کی نسبت ہمیں حق نہیں ہے کہ ہم انہیں کسی حیثیت سے برا کہیں اس لئے کہ جب شبہ ہے اس کا کہ نبی ہوں اور نبی ہونے کی حیثیت سے معصوم بھی ہوں گے تو ہمیں کیا حق ہے کہ کسی ایسے لفظ کا استعمال کریں ان کی نسبت جو فرض نبوت ان کی شان کے خلاف ہو۔ اس لئے ہمارے لئے یہ روا نہیں ہے کہ ان کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کریں کیونکہ

یہ وہ افراد ہیں جن کے متعلق عصمت کا احتمال ہے۔ اگر کسی کا قطعی طور سے کذب ثابت ہو جائے تو بیشک ایسا لفظ استعمال کر سکتے ہیں جس کا ایک کاذب مستحق ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک نفی و اثبات دونوں کے ادلہ مساوی ہوں وہاں جس طرح ہمیں ان کی نبوت کے تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اسی طرح ان کے خلاف زبان کشائی کا بھی کوئی حق نہیں رکھتے۔

یہ بحث جو میں نے پیش کی اس کا تعلق کسی اسلامی مختلف فیہ مسئلہ سے نہیں ہے کہ اس کے متعلق کوئی نتیجہ نکالا جا سکے، یہ تو اسلام اور غیر اسلام کی بحث ہے اس میں کسی اسلام کی اختلافی بحث پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا اور نہ اس سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جو اسلام سے تعلق رکھتا ہو۔

اسی طرح سے اور بہت سے توہمات ایسے ہیں جو در حقیقت ظاہر کلام پر غور کرنے سے دور ہو سکتے ہیں مستقل طور سے ان کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں نے یہ عرض کیا کہ اسلام نے تمام مذاہب کے مقابلہ میں جو رویہ اختیار کیا اس رویہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت اسلام نے بناء مخاصمت نہیں قائم کی بلکہ بناء مخاصمت فریق مقابل کی طرف سے قائم ہے، اسلام نے دنیا کے کسی مذہب کو باعتبار اس کے اصل و بنیاد کے غلط نہیں کہا، اسلام نے کسی مذہب کے دعوائے روحانیت کو جس کے متعلق وہ اپنے کو منسوب کرتا ہے رد نہیں کی، کاذب نہیں کہا بلکہ ہم نے شواہد پیش کئے جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے کچھ لوگوں کا نام لے کر تفصیل کر دی، کچھ لوگوں کے نام نہیں لئے بلکہ بطور اجمال خبر دے دی کہ ان کے علاوہ جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اور بھی افراد ہیں جن کو ہم نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا۔

بہت سے رسول ایسے ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر کیا اور بہت سے ایسے ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا، تو ہم کو کیا معلوم کہ وہ کون کون تھے جن کا ذکر نہیں کیا گیا جو ہستی ہمارے سامنے پیش ہو جس کے متعلق قابل احترام نسبت دی جائے اس کے متعلق ہمیں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی افراد میں ہو جن کی تفصیل نہیں کی گئی۔

اس لئے کہ یہ بات مشہور ہے اگرچہ قرآن مجید میں نہ ہو لیکن زبان زد عام ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث کئے گئے، قرآن مجید اور حدیث کی جستجو سے یہ مردم شماری پوری نہیں

ہوتی حدیث سے بھی جن کے اسماء ثابت ہوتے ہیں وہ بہت کم تعداد ہے۔

آپ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بچوں کو عقیدہ نبوت کی تعلیم میں یہ یاد کراتے ہیں کہ خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث کئے جن میں پیغمبر آخرالزمان ہمارے پیغمبر ہیں۔

اب ہمیں کیا معلوم کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار جو تھے ان میں زردشت نہیں تھے یا اور کوئی پیشوائے مذہب جس کے متعلق نبوت کا ادعا کیا جاتا ہے وہ نہیں تھا، لہٰذا جب تک دلائل نفی کے قائم نہ ہوں اس وقت تک نہیں کہہ سکتے کہ غلط ہے، قرآن مجید نے تمام مذاہب عالم کے سامنے آ کر کسی کو غلط نہیں کہا، باعتبار اس کے اصل و بنیاد کے بلکہ یہ کہا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں اپنے تمام پیش رووں کو جو ہماری ہدایت سے بیشتر آ چکے ہیں ان سب کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس نبی پر بھی ایمان لاؤ جس کی شریعت تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

اسلام نے کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہی بیشک ان تمام کو تسلیم کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ ہم ایمان لاتے ہیں ان سب پر جنہیں تم مانتے ہو لہٰذا تم میرے اوپر ایمان لاؤ، لیکن انکار ادھر سے ہوا اور انہوں نے تسلیم نہیں کیا۔ اگر دلائل نہ ہونے کے باعث تسلیم نہ ہوتا تو حق بجانب تھا اگر مطلوبہ دلائل کے بنیاد پر تسلیم نہ ہوتا تو صحیح تھا لیکن باوجود برہان کے پھر بھی قابل تسلیم بات کو تسلیم نہ کیا یہاں تک کہ ایمان اور کفر کی تفریق قائم ہوئی یعنی "ماننے والے" اور "نہ ماننے والے" اسلام نے کسی مذہب کے خلاف اس کے اصل و بنیاد پر کوئی ایسا خط انکار نہیں کھینچا کہ دنیا کو اسلام کے مقابلہ میں صف آرائی کی ضرورت ہوتی، بلکہ اس نے کہا کہ اسلام تو درحقیقت وہ چیز ہے جس کو تمام انبیاء و مرسلین لائے تھے۔ اسلام کوئی نئی چیز نہیں اسلام ہر زمانہ میں اسلام تھا اور ہر زمانہ میں اس کے مقابل کفر تھا مفہوم اسلام اور کفر کا نہیں بدلا، مفہوم ایک ہی ہے جیسے (میں اس کی مثال بھی آپ کے سامنے پیش کروں) ایک شخص نے اپنے تمام دوستوں سے یہ خواہش کی ہے کہ تم ہماری اولاد کو نظر عزت سے دیکھنا، اتفاق سے جس وقت اس نے یہ خواہش پیش کی تھی اس وقت اس کے ایک ہی فرزند تھا دائرہ کلام کا مفہوم اس کا یہی تھا کہ اس کی اولاد کو اس کے بعد عزت کی نظر سے دیکھا جائے مگر اس وقت ایک ہی فرزند تھا سال بھر کے بعد اس کے یہاں ایک اور فرزند ہوا اور وہ بڑھا تو حکم وہی ایک مفہوم نہیں بدلتا۔ اس کے بعد مردم شماری اور بڑھی نسل میں ترقی ہوئی

افراد میں کثرت پیدا ہوئی جتنی چاہے اولاد میں کثرت ہو جائے مفہوم نہیں بدلتا لیکن مصداق میں تغیر پیدا ہوتا ہے اگر کسی نے ایک کی مخالفت کی تو اس حکم سے عدول ہوگا لیکن اس وقت میں وہ ایک ہی تھا اور اب ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تو کیا معنی بدل گئے؟ معنی تو وہی ایک رہے لیکن وسعت میں اس معنی کی تفریق ہوتی گئی ویسے ہی "اسلام" کیا؟ تسلیم کرنا خدا کے پیغام کو "کفر" کیا؟ نہ ماننا۔ جس وقت آدم مبعوث ہوئے ایک نبی دنیا میں آیا تھا اس لئے اسلام کیا؟ اس کا ماننا، کفر؟ اس کا نہ ماننا۔ نوحؑ آئے، اب اسلام کیا ہے؟ معنی میں اسلام کے کوئی تفریق نہیں ہے اب بھی وہی ہے "خدا کے پیغام کا ماننا" اب بھی وہی "خدا کے فرستادہ کا تسلیم کرنا" لیکن "فرستادہ" پہلے فقط آدمؑ ہی کی ذات تھی۔ اب نوحؑ کا اضافہ ہو گیا لہٰذا جو نوحؑ کو نہ مانے اس نے پیغام الٰہی کو تسلیم نہیں کیا، کل تک فقط آدمؑ کا ماننے والا مسلم تھا، آج وہی فقط آدمؑ کا ماننے والا کافر اس کے بعد "نبوت" پہنچی حضرت ابراہیم تک، مفہوم اسلام کا کیا؟ پیغمبر کو تسلیم کرے وہی مفہوم اسلام کا لیکن کل تک صرف آدمؑ و نوحؑ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا مسلم تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ دو ہی تو تھے، اب جس وقت ابراہیم مبعوث ہوئے تو اب بھی مفہوم "اسلام" و "کفر" کا وہی تھا مگر اب؟ آج فقط آدمؑ و نوحؑ کا ماننا کفر ہے کل تک وہ مسلم ہے آج وہ کافر ہے۔ اس کے بعد موسیٰؑ آئے اسلام کچھ بدل گیا؟ نہیں وہی رہا، یعنی تسلیم کرنا ہمارے پیغام کا، ہماری طرف سے آئے ہوئے رہنماؤں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، مگر وہی تفریق ہو گئی کل تک آدمؑ، نوحؑ، ابراہیم کا ماننے والا مسلم تھا آج جب موسیٰؑ آئے تو صرف ان کو نہ ماننا اور سب کو ماننا کفر ہے۔

اس کے بعد سلسلہ اور بڑھا عیسیٰؑ آئے اسلام وہی رہا لیکن نتیجہ مختلف ہو گیا۔ اب موسیٰؑ پر ایمان لانے والا کل تک مسلمان تھا آج موسیٰؑ پر ایمان لانے والا اور مسیحؑ پر ایمان نہ لانے والا کافر ہے۔

اب عیسیٰؑ کے بعد خط نبوت کھنچا، نقطہ خاتمیت تک پہنچا، جناب رسول مبعوث ہوئے کیا اسلام اب کوئی نیا اسلام ہوگا؟ "لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" وہی خدا کی فطرت وہی خدا کی پہلی بات، خدا کا طریقہ، راستہ اب بھی نہیں بدلا، اسلام بھی وہی ہے کفر بھی وہی ہے لیکن نتیجہ

مختلف ہو گیا، کل تک عیسیٰؑ کو مان کر خاموش ہو جانے والا مسلم تھا آج عیسیٰ کو مان کر کسی ایک ہستی کو نہ ماننے والا کافر ہے۔

اسلام کا مفہوم ہر گز نہیں بدلا، لیکن جتنا دائرہ آگے بڑھتا جاتا ہے اتنی دائرہ میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے یہودی کو بھی مسلم بنا دیا، میں نے عیسائیوں کو بھی مسلم بنا دیا میں اصل کے اعتبار سے سب کو مسلم کہہ رہا ہوں ہر ایک اپنے نقطہ ابدا کے اعتبار سے مسلم تھا ماننے کے بعد اور نہ ماننے کے بعد کافر تھا، اسلام اور کفر کی تفریق جو قائم ہوئی وہ ماننے اور نہ ماننے کی وجہ سے، اسلام نے دنیا میں کوئی بات ایسی نہیں قائم کی جو سبب افتراق ہو" لا نفرق بین احد من رسلہ" "ہم کسی میں تفریق نہیں کرتے ہم سب کو مانتے ہیں لیکن انکار جہاں سے شروع ہوا وہاں سے افتراق پڑا" وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ "اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو درحقیقت افتراق ڈالنے والے یہ ہیں۔ سب سے پہلا روادارانہ طرز عمل تھا جو اسلام نے تمام مذاہب عالم کے مقابلہ میں اختیار کیا، اس کے بعد بھی یہ دیکھئے کہ جب دنیا نے انکار کیا تو انکار کے بعد تفریق کی بنیاد قائم ہوئی اور اسلام اور دوسرے مذاہب جداگانہ حیثیت سے دنیا میں قائم ہوئے۔ تو اب اسلام نے مسلمانوں کو کیا ہدایت کی؟ کیا یہ ہدایت کی کہ بس، اب تمہاری تلواریں ان کے قلع قمع میں مصروف ہو جائیں؟ بس اب ان کی جماعت کو متفرق کر دو، بس اب ان کے وجود سے صفحہ ارض کو پاک وصاف کر دو، کیا یہی حکم تھا مسلمانوں کو؟

میں نے کل پیش کیا کہ اگر یہ انکار کریں تو درحقیقت غلطی ہے ان کی، ذمہ داری افتراق کی ان کے اوپر ہے مگر" فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ "خدا تمہارا مددگار ہے خدا پر بھروسا کرو، وہ سننے والا ہے وہ جاننے والا ہے۔

اس کے بعد مختلف انداز سے مسلمانوں کو تشدد سے روکا، حد سے بڑھنے سے باز رکھا، رسالت مآبؐ کو مخاطب کر کے (حالانکہ دوسروں کو سنانا منظور تھا) ارشاد ہوا:۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.

کیا تم لوگوں پر جبر کرو گے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں؟

کبھی یہ ارشاد کیا:۔

وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ.

تمہیں ان پر جبری طاقت نہیں دی گئی۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ.

ہمارے رسول پر جو ہے وہ تبلیغ کر دینا ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔

اب رسولؐ کو یہ تعلیم دی کہ تم یہ کہو:۔

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ.

اس سے زیادہ تمہارے اوپر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔درحقیقت ہمارا کام جو کچھ بھی ہے وہ کلمہ حق کی آواز کو پہنچا دینا ہے اس سے زیادہ کوئی فرض نہیں ہے نہ ہمیں اس سے زیادہ کوئی قدرت حاصل ہے۔

اس کے بعد جس وقت آپ قرآن مجید میں آیات کو دیکھئے جس میں کفار و مشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کیسا روادارانہ پہلو کارفرما ہے۔ان آیات میں جن میں خطاب کیا گیا ہے مختلف مذاہب کو دنیا کے، ارشاد ہوتا ہے:۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ.

آپ توریت کا مطالعہ کر جائیے، انجیل کا مطالعہ کر جائیے، آپ دنیا کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کر جائیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ توریت میں خدا کو بنی اسرائیل کا خدا کہا جاتا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ خدائی میں بھی تفریق ہے وہ دوسروں کا خدا نہیں ہے انہوں نے خدا کو اپنا کر لیا ہے اسرائیل کا خدا کہتے ہیں، انجیل میں بھی اس کی اولاد میں اپنے ہی کو بتایا گیا ہے۔کہا گیا ہے ہمارا وہ باپ ہے اور ہم اس کی اولاد ہیں ہمارے سوا اس کے کوئی اولاد نہیں ہے۔

درحقیقت خدا کی خدائی کو صرف اپنے سے مخصوص کر لیا۔قرآن مجید نے ان کے خیال کو بھی لکھا ہے:۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ. قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ.

وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں (کہو) تو پھر خدا تم پر عذاب کیوں کرنے لگا"

اسی طرح ان لوگوں کا مزعومہ یہ تھا کہ خدا کے ساتھ جو رشتہ ہم کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں ہے، خدا تو ہمارا ہی خدا ہے، دوسروں کا نہیں ہے تقاضا تو جواب کا یہی تھا کہ جب یہود کہتے کہ خدا ہمارا، نصاریٰ کہتے کہ خدا ہمارا، تو اسلام بھی کہتا کہ خدا ہمارا، اور کسی کا نہیں۔ عیسیٰؑ کی افتادِ طبع دنیا میں رائج تھی اسلام بھی یہی کہتا کہ "رب المسلمین" لیکن اسلام کی رواداری ایسے تنگ خیال کی موید نہیں تھی، اسلام نے ایک طرف یہ اعلان کیا کہ جو ربوبیت کا ظاہری مقصود ہے کہ وہ "رب العالمین" ہے۔ "رب العالمین" کیا؟ جتنے عالم ہیں وہ سب کا رب ہے نہ ہمارا ہے نہ تمہارا ہے، وہ تو سب کا ہے، سب کے ساتھ اس کو ایک نسبت حاصل ہے تشریح کے ساتھ اپنی رواداری کو ظاہر کردیا "اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ" "تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو؟ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اس کا ہمارے اور تمہارے ساتھ یکساں تعلق ہے، یکساں ربط ہے!۔

"لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" "ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔ اس میں مخاصمت کیسی؟۔

بہر حال ہم کو بھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا ہے اور تم کو بھی اپنی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ ہمارے اعمال کی بھی جواب دہی خدا کے یہاں ہے تمہارے عمل کی بھی جواب دہی خدا کے یہاں ہے" ونحن لہ مخلصون" اور اس کے لئے خالص عبادت بجالانے والے ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کی یہ آرزوئیں تمنائیں تھیں کہ جب ہم ہی خدا کے ساتھ رشتہ محبت رکھتے ہیں تابعداری کرتے ہیں تو بس نجات بھی ہمارا ہی حق ہے!۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.

یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہ داخل ہوگا جنت میں مگر وہ کہ جو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ ارشاد ہوتا ہے یہ ان کی آرزوئیں ہیں ان کی امیدیں ہیں جن کے باغ نظروں کے سامنے لہلہا رہے ہیں "ان سے کہو کہ ہم تو دلیل کے پابند ہیں" فقط زبانی دعووں سے کام نہیں چلتا "هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" "ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ تم غلط کہتے ہو لیکن ثبوت تم کو پیش کرنا چاہیے، دلیل

پیش کرنا تمہارے ذمہ ہے "دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو"

اسلام ان کے مقابلہ میں آ کر تمام دنیا کے سامنے کہنے کا حق رکھتا تھا کہ نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ کہ جو مسلم ہو اس لئے کہ کافر جنت میں نہیں جا سکتا اگر کہتا بھی تو سچ کہتا، مگر اپنے مخاطبہ میں انداز رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم غلط کہتے ہو، در حقیقت مسلم ہی بحیثیت مذہب بحیثیت فرقہ اس کے حقدار ہیں کہ جنت میں جائیں بلکہ اسلام نے ایک معیار پیش کر دیا۔

یہودی کہتے ہیں ہم جنت میں جائیں گے، نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم جنت میں جائیں گے، اسلام نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ تم ثبوت پیش کرو۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

بَلٰى ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.

ہم تمہارے مقابلہ میں یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تم جہنم میں جاؤ گے اور ہم جنت میں جائیں گے بلکہ ہم معیار پیش کرتے ہیں۔

"بے شک! جنت کا مستحق وہ شخص ہے جو خدا کے پیغمبر کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اچھے اچھے کام کرے، اس کے لئے اس کا اجر ہے خدا کی بارگاہ میں اور کوئی خوف اور حزن اس کے لئے نہیں ہے روز قیامت"

اگر تمہارے اوپر یہ معیار منطبق ہوتا ہے تو تم ہی جنت کے مستحق سہی، اگر ہمارے اوپر ہے تو ہم جنت کے مستحق۔ اس طرح انداز بیان میں نرمی کا لحاظ رکھا گیا، مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا.

بہت سخت لب و لہجہ ہے قرآن مجید کا یہاں پر۔ مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا گیا ہے:

اے مسلمانو! اپنے اسلام پر بھول نہ جانا جنت کی بنیاد نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے نہ اہل کتاب کی

آرزو پر نہ تمہارے خیالات کے سبز باغ جنت کے حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں اور نہ اہل کتاب کے "جو برا کام کرے گا اس کو اس کا بدلہ دیا جائے گا (ہمت شکن ہے آیت! ان لوگوں کے لئے جو فقط ظاہری اسلام پر بھولتے ہیں) مسلمان بحیثیت مسلمان صرف اس لئے کہ اسلام کے دائرہ میں ہیں۔

یہودیوں کی طرح یہ نہ کہیں کہ بس ہمارے لئے نجات ہوگی۔ قرآن مجید مسلمانوں کو ایک صف میں کھڑا کر رہا ہے یہود و نصاریٰ کے ساتھ، اہل کتاب کی یہ تمنائیں تھیں کہ بس یہودیت ہی کافی ہے۔ یا نصرانیت ہی کافی ہے مگر مسلمانوں سے خطاب ہو رہا ہے "تم صرف اسلام کو صرف کلمہ کے زبان پر جاری کرنے کو کافی نہ سمجھ لو، کچھ نہیں ہوتا تمہاری آرزوؤں سے" جو برا کام کرے گا اس کو بدلہ دیا جائے گا اور خدا کے سوا کوئی مددگار اس کو نہیں ملے گا نہ انہیں اور نہ تمہیں۔

اس کے بعد مسلمانوں کو رواداری کی تعلیم دینے کے لئے ارشاد کیا کہ تم اپنی خبر لو کسی کو نہ کہو کہ تمہیں نجات نہیں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

اے اسلام لانے والو! تمہیں اپنے نفسوں کی خبر رکھنا چاہیے تم اپنے نفسوں سے ہوشیار رہو، اگر دوسرا گمراہ ہے تو تم ہدایت کے راستے پر ہو، خدا کی طرف تم سب کی بازگشت ہے، وہ تمہیں خبر دے گا ان تمام اعمال کی جو تم بجالاتے رہے ہو۔

عمل کی باز پرس وہاں ہوگی، تم اپنی داخلی اصلاح کرو، دوسرے سے لڑنے جھگڑنے سے کیا مطلب، دوسروں کے کام ان کے ساتھ ہیں، تم اپنی طاعت کے جادہ پر قائم رہو، اس کے بعد رسول سے مخاطب ہو کر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ

اگر یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں (معلوم تو ہوتا ہے کہ جواب اس کا بہت سخت ہوگا مگر نہیں ایسا جواب نہیں تعلیم ہوتا) تو حرج کیا ہے تم ان سے کہو کہ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں اور تم

اپنے کام کے ذمہ دار ہو تم بری ہو اور بیزار ہو اس سے جو ہم کام کرتے ہیں ہم بے تعلق ہیں تمہارے کاموں سے۔

اس کے بعد پھر روئے خطاب متوجہ ہوتا ہے دوسروں کی طرف:۔

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ

یہ بھی تمام عالم انسانیت سے خطاب ہے: اے گروہ مردم! خدا کی طرف سے حق تمہارے پاس آیا ہے تو جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے خود نجات کا سامان کرے گا اور جو راستہ سے منحرف ہوگا وہ اپنا نقصان کرے گا میں تمہارے افعال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں میں تمہارے طرز عمل کا نگراں نہیں ہوں۔

اس کے بعد مسلمانوں کو تعلیم دی جا رہی ہے:۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ۔ وَانْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ

جو ایمان نہیں لاتے، تسلیم نہیں کرتے ان سے کہو کہ تم اپنی جگہ پر بطور خود عمل کئے جاو، ہم بھی کچھ نہ کچھ عمل کرتے ہیں انتظار کرو کہ کس کا عمل نتیجہ میں کامیاب ہوتا ہے (بالکل مساویانہ گفتگو) جو الفاظ ان کے لئے استعمال کئے گئے وہی اپنے لئے استعمال کئے تا کہ کسی کو ناگوار نہ ہو۔

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔ وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِينَ

میں تو اس پر مامور ہوں کہ عبادت کروں اس گھر (خانہ کعبہ) کے مالک کی جس نے اس کو محترم قرار دیا ہے اور وہی ہر شئے کا مالک ہے اور میں مامور ہوا ہوں کہ اسلام اختیار کروں اور قرآن کی تلاوت کروں تو جو شخص ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنا نفع کرے گا اور جو اس راستے کو چھوڑے گا تو (کچھ نہیں) اس سے کہہ دو کہ میرا کام تو فقط ڈرا دینا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ.

تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور ہمارے لئے ہمارا دین ہے تم اپنے راستے پر قائم رہو ہم اپنے راستے پر قائم رہیں، اس کا فیصلہ وہاں ہو جائے گا اس طرح تمام دنیا کو مخاطب کر کے یہ تعلیم دی کہ درحقیقت ایک مسلمان دوسرے شخص کو صرف تبلیغ کرے، صرف حق کی آواز پہنچا دیا کرے۔ جو ہر انسان کا فرض انسانیت ہے، فرض ہے کہ جس نقطہ نظر کو وہ سچا سمجھتا ہو دوسروں کو بھی اسی راستہ پر چلنے کی دعوت دے، اس لئے کہ دنیا کی ہلاکت سے زیادہ آخرت کی ہلاکت اہمیت رکھتی ہے جس طرح ایک کنواں کھدا ہوا ہو آپ کے ساتھ چراغ ہو، آپ بچ کر نکل گئے دوسرا چراغ لئے بغیر اندھیرے میں جانا چاہتا ہے تو یہاں آپ کی خاموشی جرم کی حیثیت رکھتی ہے، آپ کا فرض ہے کہ آپ جتلا دیجئے کہ راستہ میں کنواں ہے، اور حتی الامکان اس کو باور کرانے کی کوشش کی ہے یعنی اگر آپ کے کہنے کو نہیں مانتا قسم کھانے کی ضرورت ہے قسم کھا کر بتایئے جتنا زور دے کر کہنے میں امید ہو کہ مان لے گا اتنا زور دے کر کہئے اگر ضرورت ہو تو چراغ ساتھ لے کر چلے جایئے۔

اس نظریہ کے تحت میں تبلیغ لازم ہے اس لئے کہ یہ تو دنیا کا کنواں ہے جس میں انسان گرتا ہے لیکن وہاں ہلاکت ابدی میں مبتلا ہوتا ہے اس لئے فرض ہے کہ جس بات کو حقیقتاً وہ صحیح سمجھتا ہو اس کو وہ دوسرے تک بھی پہنچائے لیکن بس وہیں تک کہ تبلیغ کے حد میں رہے جہاں تک زور دینا چاہیے اتنا ہی زور دے جتنا ادلہ اور براہین کے ساتھ آپ اپنے نقطہ نظر کو واضح کر سکتے ہیں اتنا واضح کیجئے۔

یہ واجب ہے مگر آپ لڑئے جھگڑئے، دنیا میں فتنہ وفساد پیدا کیجئے یہ تعلیم نہیں دی گئی ہے۔

اگر یہ چیزیں پیش نظر ہو جائیں تو جھگڑوں کا سدباب ہو جائے جھگڑا تو یوں ہی ہوتا ہے کہ دوسروں کے عمل کا بھی اپنے کو ٹھیکہ دار سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصادم ہوتا ہے اگر کوئی آپ کے نزدیک برا کام کرتا ہے تو کہہ دیجئے کہ یہ برا کام ہے مگر آپ لڑائی جھگڑے کا کیا حق رکھتے ہیں یہ

تصادم اسلامی تعلیم سے بے خبر کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے نام سے جس کسی کے مقابلہ میں ہم کوئی فساد کھڑا کر دیں تو وہ اسلام کی ایک خدمت ہوگی، اسلام کا کبھی یہ حکم نہیں ہے۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کو جو امن پسند ہوں خواہ وہ غیر مسلمین ہوں، تعریف کی ہیں، ہم تو اتنے تنگ نظر ہو گئے ہیں کہ اگر کسی سے نقطہ خیال میں فرق ہے تو اس کی اچھائی بھی زبان پر نہ لائیں گے، مگر اسلام نے غیر مسلمین کی تعریف کی ہے جو امن پسند ہوں، جن کا طرز عمل جارحانہ نہ ہو، اہل کتاب سب ہی تھے یہودی بھی اور نصاریٰ بھی لیکن تاریخی حیثیت سے اور حقیقت کے اعتبار سے جس قسم کا طرز عمل اسلام کے خلاف یہودیوں نے اختیار کیا، نصاریٰ نے نہیں اختیار کیا۔ قریظہ اور نضیر کی لڑائیاں یہودیوں ہی سے تھیں، جنگ خیبر بھی یہودیوں کے مقابلہ میں تھی، یہودیوں نے فوج کشی کی صف آرائی کی لیکن نصاریٰ وہ تھے جنہوں نے پہلے بہ دلائل و براہین اسلام کا مقابلہ کرنا چاہا محاجہ واستدلال کیا پھر پر امن مقابلہ یعنی مباہلہ کی صورت اختیار کی اور جب اس میں ناکامی رونما ہوتے ہوئی دکھلائی دی تو تعصب دامن گیر ضرور ہوا کیونکہ اب اسلام لے آنا تھا مگر ایسا نہیں ہوا آگئی وہ محبت جو اپنے پرانے عقیدہ کے ساتھ تھی، اور یہ کہہ کر اپنے نئے نبی کے سامنے ایمان کو قبول نہ کرو اس نے ایمان لانے سے باز رکھا، مگر جزیہ دے کر مصالحت پر تیار ہو گئے ایمان نہیں لائے، لیکن اتنا امن پسندانہ طرز عمل اختیار کیا کہ قرآن مجید میں اس بات کی تعریف موجود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا، وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى، ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ.

سخت سے سخت دشمنی تم مسلمانوں کے ساتھ دیکھو گے یہودیوں کی اور ان لوگوں کی جو شرک اختیار کرتے ہیں (یعنی مشرکین قریش) اور دیکھو گے سب سے زیادہ قریب محبت کے اعتبار سے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔

بات یہ ہے کہ ان میں پادری لوگ ہیں اور ان میں پہاڑوں پر جا کر تمام دنیا سے بے تعلق

ہوجانے والے عابد موجود ہیں، یہ دیکھئے اسلام کی سچائی اور انصاف پسندی، دنیا کہتی ہے اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ یعنی جس نے اسلام کے مقابلہ میں سرتابی کی، بس تلوار کھینچ لی مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ جن لوگوں نے صلح پسندانہ طرز عمل اختیار کیا ان کو اسلام الگ رکھتا ہے اور جن لوگوں نے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا ان کو الگ رکھتا ہے اگر ایسا نہیں تھا تو کیوں نہ اسلام نے نجران میں تلوار کھینچی، کیوں نہ یمن میں عیسائیوں کو برباد کردیا؟ بے شک جن لوگوں نے بزور شمشیر مادی طاقتوں سے چاہا کہ اسلام کو فنا کردیں ان کا رد عمل اسی طریقہ سے کیا گیا جو ان کے طرز عمل کا نتیجہ تھا اس لئے کہ ہر چیز کا جواب ہوتا ہے۔

اسلام نے ان لوگوں کی مدح کی جو غیر مسلمین میں سے امن پسند تھے جو امن کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

مگر ہم نے اسلام کے تعلیمات کو بھلا دیا، اس لئے روزانہ مشکلات ہیں، روزانہ مصائب ہیں یاد رکھئے کہ اگر اسلام کے طرز عمل کو ہم اپنا نقطہ نظر قرار دیں تو ہم خود بھی امن وامان سے رہیں اور دنیا بھی ہمارے ہاتھ سے امن وامان میں رہے۔

مگر ہم نے اس تعلیم کو فراموش کردیا، ہم غیر مسلم کے ساتھ تو کیا اپنوں کے مقابلہ میں رواداری کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم نے یہ بھلا دیا کہ اسلام نے مشرکین قریش کے ساتھ بھی امن پسندی کو نہیں چھوڑا "وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ" اگر یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاو اور خدا پر بھروسا کرو۔

ہمارے سامنے قرآن مجید میں موجود ہے "الصُّلْحُ خَيْرٌ" صلح بہترین چیز ہے۔ ہمارے سامنے یہ ہے کہ مشرکین قریش کے ساتھ جو برابر اسلام سے لڑتے رہے، قرآن مجید نے یہ تعلیم دی "وَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ" اگر یہ تم سے جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو، اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدا ادھر سے قرار پائے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَاقْتُلُوهُمْ" اگر یہ تم سے وہاں (مسجد حرام میں) جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو حفاظت خود اختیاری کے طور پر۔ جو انسان کا فطری اور لازمی فریضہ ہے۔

مسلمانوں کے باہمی تعلقات

ہمارے سامنے یہ تعلیمات پیش کئے گئے کہ تم خدا کی رسی کو مضبوط تھامو اور متفرق نہ ہو، کہا گیا کہ درحقیقت تم بھائی بھائی ہو کہ آپس میں جھگڑا نہ کرو آپس میں لڑو نہیں۔ اے مسلمانو! نہیں تو یاد رکھو کہ تمہارے قوائے عمل کمزور ہوجائیں گے اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی "وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ" وہی ہوا جو ہمارے آپس کے افتراق کا نتیجہ تھا کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی حقانیت کے برکات تھے، حقانیت کی طاقت تھی وہ رخصت ہوگئی لیکن ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ہم بیدار نہیں ہوتے، ہمارے یہاں روز روز نئے نئے فسادات ہوتے ہیں، کون زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ جس میں کوئی نہ کوئی فساد نہیں ہوتا جتنا دائرہ محدود ہے اتنا ہی زیادہ جنگ وجدال ہے۔ ہم تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے، اگر سمجھتے ہوتے تو ویسا ہی برتاؤ بھی اختیار کرتے، دشمنی اور عداوت اور چیز ہے اور اختلاف خیال اور چیز، نقطہ خیال کا افتراق تو انسانی ذہنیت کا خاصہ ہے۔

بہرحال ہر شخص کو اپنے ذاتی نقطہ خیال کا اختیار ہے جس کو وہ صحیح سمجھے اس کو مانے، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی سے نقطہ نظر جدا ہوجائے تو ہم اس کے دشمن بھی ہوجائیں، اگر ایسا طرز عمل ہو تو نظام دنیا میں خلل پڑ جائے، ہر جماعت میں اختلاف ہوا کرتے ہیں وہ لوگ کہ جو مستقل فرقوں میں محسوب ہیں ان میں بھی آپس میں ایسے ذاتی اختلافات ہیں مسائل میں کہ ہر ایک ان میں سے ایک نقطہ پر جمع نہیں ہوتا، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو تلوار سے فنا کردے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہ سمجھانا بھی فتنہ وفساد کی بنیاد قرار دیا جائے یہ تو کسی جرم کے تحت میں نہیں آتا، نہ اسے دل آزاری سمجھنا چاہیے، نہ ایذا سمجھنا چاہیے۔ ایک بات ہمارے نزدیک صحیح ہے آپ کے نزدیک غلط ہے لیکن اس کی وجہ سے کیوں فتنہ وفساد قائم ہو؟ ہم اپنے خلاف بات سننے پر تیار کیوں نہ ہوں؟ ہم اتنے تنگ نظر ہیں کہ بس اسی کو سن سکیں گے جو بات ہمارے خلاف نہ ہو لیکن چاہے کتنے ہی ملائم لفظوں میں کیوں نہ ہو، اسے ہم سننے پر ہی تیار نہیں جو ہمارے نقطہ نظر سے ذرا مخالف ہو۔

یہ آخر ہم اپنے گوش اعتبار پر پردے کیوں ڈال لیں ہم اپنی چشم حقیقت بین کو حجاب میں کیوں چھپائیں، ور حقیقت خدا نے آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے لئے، کان دیئے ہیں سننے کے لئے، اگر کان دیئے ہیں سننے کے لئے تو ان سے ہم کو اپنے خلاف باتیں بھی سننا چاہیے تاکہ ہماری قوت تمیز بھی کام کر سکے، تمیز تو جداگانہ چیزوں میں ہی ہوا کرتی ہے اگر جداگانہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو قوت تمیز بیکار ہوگی اس لئے ہم میں اتنی وسعت نظر پیدا ہونا چاہیے کہ کشادہ دلی سے اپنے خلاف باتیں بھی سن سکیں، رواداری سے اپنے خلاف باتیں بھی سن سکیں جس طرح اپنی بات سن سکتے ہیں اسی طرح اپنے غیر کی بات بھی سن سکیں، اس کے بعد یہ اختیار ہے ہم کو کہ ہم مانیں یا نہ مانیں، سن کر ہاتھ پاوں میں زنجیریں تو پڑ نہیں جایا کرتیں، اگر صحیح معلوم ہو تسلیم کرلیں، غلط معلوم ہو چھوڑ دیں۔ یہ ہی تعلیم ہے جو اسلام نے دی، اس نے مشرکین کی بھی آوازوں کو سنا، یہودیوں کی بھی آوازوں کو سنا، نصاریٰ کی بھی آوازوں کو سنا جواب کا موقع ہوا جواب دیا۔

لیکن یہ کہ سننے ہی کو تیار نہ ہوں، یہ اسلام نے مسلمانوں کو تعلیم نہیں دی، اس نے تو مذمت ان لوگوں کی کی ہے "یہ لوگ تو جب تم بات کہنا چاہتے ہو تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں تاکہ کچھ نہ سنیں" یہ تو کافروں کا طرز عمل تھا، ہم کو تو سننا چاہیے، چاہے جیسی بات ہو، اس کے بعد ہمیں یہ حق ہے کہ کہہ دیں غلط ہے صحیح نہیں ہے اس کے غلط کہنے پر کہنے والے کو بھی برا نہ ماننا چاہیے، اگر یہ بات پیدا ہو جائے تو پھر دنیا میں فتنہ وفساد نہ ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں مختلف نظریوں کا وجود ہی نہ ہو یہ محال ہے۔

یہ اختلاف نہیں مٹ سکتا، اگر خدا انہیں اپنی جبری طاقت سے چاہے تو سب کو ایک کردے گا لیکن خدا اپنی جبری طاقت کو تو صرف ہی کرنا نہیں چاہتا، اس نے تو اختیار دے دیا جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بدلا کاہے کا ہوتا اسی معصیت کے اختیار پر تو بدلے کی بنیاد قائم ہے جزا اور سزا کی بنیاد قائم ہے۔ اب اگر نظام عالم درست ہو سکتا ہے تو اسی طرح سے درست ہو سکتا ہے کہ اختلاف نظر کے ساتھ ساتھ ہر ایک دوسرے کے اختلاف خیال کو برداشت کر سکے، تب ہی نظام دنیا درست ہو سکتا ہے۔

خصوصاً ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں کان ہے مذہبوں کی، جتنے پرانے تھے وہ تو تھے

ہی اور خدا پنجاب کی زمین کو سلامت رکھے کہ مذہب کی پیداوار بھی ہوتی ہے یوں سب ایک ہوسکیں یہ ناممکن ہے۔ اگر ہم دنیا کی ہستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو یہ طرز عمل ہونا چاہیے کہ ہر ایک کو اس کا نقطہ نظر مبارک، تم کچھ کہو ہم تسلیم نہیں کرتے مگر لڑنے پر تیار نہ ہوں، ہم جو کہیں اس میں دوسرے کو اعتراض نہ ہو یوں تو دنیا قائم رہ سکتی ہے۔

عناصر دنیا میں اضداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آگ پانی کو ہوا کر دینے پر تیار اور پانی آگ کے بجھانے پر آمادہ تو نظام عالم درہم و برہم ہوجاتا مگر ایسا نہیں ہے تو کیا ہوا؟ آگ نے اپنی خاصیت کو چھوڑ دیا؟ پانی نے اپنے اثر کو ترک کر دیا؟ ہر ایک میں اثر موجود ہے، اپنی اپنی حد میں، ایک دوسرے اثر کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کرتا نہیں تو یہ عالم ہی تباہ ہو جاتا۔ یہ نظام کائنات ہی قائم نہ رہتا۔

مگر ایک دوسرے کی حد میں قدم نہیں رکھتا اس نظام کو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھ کر ہم کو یہ سبق دیا کہ تم اپنے حدود عمل میں رہ کر یوں انتظام کرو یوں مختلف عناصر کو اپنے ہاتھ کے اندر رکھ کر تنظیم کرو۔ میں کہتا ہوں تنظیم اس طرح ممکن ہے خدا نے اس کی تعلیم دی کہ ہر ایک اپنے نقطہ نظر میں رہے تو پھر تم ایک لڑی میں منسلک ہو سکتے ہو۔ جب چاہا اس طرح سے الگ الگ رکھ کر دکھا دیا، جب چاہا ایک جسم میں عناصر کو جمع کر کے دکھا دیا کہ دیکھو! اس طرح سے متحارب قوتیں ایک جگہ جمع کر کے انتظام کرتے ہیں۔

لیکن ہم میں اگر اتنی وسعت نظر نہیں ہے کہ ہم دوسرے کی بات کو سن سکیں تو تصادم ہوگا اور تصادم کے نتیجہ میں فنا ہوں گے۔ اس لئے کہ کمزور اور طاقت ور کا مقابلہ جب ہو تو پہلے تو طاقت ور کمزور کو فنا کر دے گا مگر طاقتور پر بھی اثر ضرور پہنچے گا نقصان دونوں طاقتوں کو ہوگا۔

ہم کو اسلام کی تعلیم کو سرنامہ عمل قرار دینا چاہیے، اگر ایسا کریں تو ہم امن و خاموشی کی اس جنت میں پہنچ جائیں جہاں آرام و راحت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن ہم اس پر عمل نہیں کرتے اس لئے یہ تمام تکلیفیں ہم کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

محمد بن عیسیٰ نے اپنی سند سے صالحین علیہم السلام سے روایت کی ہے کہ فرماتے تھے کہ اس دعا کو تیئیسویں کی رات سجود، قیام، قعود اور جس حالت میں بھی بیٹھا ہوا ہے اور پورے ماہ رمضان المبارک میں اور جس وقت میں بھی تجھے یہ دعا اپنی زندگی کے ایام میں یاد آجائے بار بار پڑھتا رہے اور وہ دعا یہ ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰهُمَّ كُنْ لِوَلِيِّكَ الْحُجَّةِ ابْنِ الْحَسَنِ صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَ عَلٰى آبَائِهِ فِي هٰذِهِ السَّاعَةِ وَفِي كُلِّ سَاعَةٍ وَلِيًّا وَ حَافِظًا وَ قَائِدًا وَ نَاصِرًا وَ دَلِيلًا وَ عَيْنًا حَتّٰى تُسْكِنَهُ أَرْضَكَ طَوْعًا وَ تُمَتِّعَهُ فِيهَا طَوِيلًا

مطبوعہ کتابیں

خطبہ غدیر
تعداد صفحات ۳۲

مرآۃ الرشاد
وصیت نامہ عبداللہ مامقانی
تعداد صفحات ۱۲۰

غیر مطبوعہ کتابیں

حقیقتِ اسلام
متوقع 2020

سید العلما نقن صاحب کی چند کتابوں کا خلاصہ
متوقع 2020

خطبہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا
متوقع 2020

ناشر
ادارہ حضرت مقدادؓ